ہماری دعوت

- طلبہ میں کتاب دوستی کے کلچر کو فروغ دینا۔
- طلبہ تک فرقہ واریت کی تفریق سے بالاتر ہو کر اپنی دعوت پہنچانا ان کو علم حاصل کرنے کی طرف راغب کرنا اور اس کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے کا احساس طلبہء میں بیدار کرنا۔
- ادبی وعلمی محافل کا اہتمام کرنا۔
- جو طلبہ لکھنے کی کوشش کر رہے ہو ان کی راہنمائی اور ان کو منظّم کرنا۔
- جو طلبہ قلم قرطاس ادبی مجلس کے نظم میں منسلک ہو جائیں ان کے لیے اسلام اور جدید علوم کے وسیع مطالعہ، سیرت و کردار کی تعمیر اور خداداد صلاحیتوں کی بھرپور نشوونما کرنا۔
- معاشرے میں طبقاتی کشمکش اور سیاسی استحصال سے پاک معاشرے کے قیام کی قلم اور قرطاس کے ذریعے جدوجہد کرنا۔

قلم قرطاس ادبی مجلس

شعبہ اردو گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی فیصل آباد

حسنِ ترتیب

شاعری

علامہ حامدؔ وارثی

نعت

آپؐ ایمان کی ہیں جان مدینے والے
آپؐ قرآں کے ہیں قرآں مدینے والے
ہو گئے ختم کمالاتِ نبوت تم پر
آپؐ ہیں ناسخِ ادیان مدینے والے
ہے مشہور کہ احمدؐ ہے احد سے مشتق
اللہ اللہ آپؐ کی شان مدینے والے
یہ مضامین کا تسلسل اور یہ حسنِ بیان
آپؐ کا ہے سارا احسان مدینے والے
دیکھ لوں اک بار میں گنبدِ خضریٰ تیرا
دل میں ہے بس یہی ارمان مدینے والے
آپؐ کے لطف و کرم کا ہوں طلب گار فقط
میں کہ ہوں بے سر و سامان مدینے والے
شدت امراض نے لوٹ لیا دل کا سکوں
اب تو کچھ ہو جائے درمان مدینے والے
حامدؔ عاصی پہ اللہ ہو عنایت کی نظر
آپ ہیں صاحبِ احسان مدینے والے

اداریہ

ایک صاحب جن کا تعلق شعبہ سائنس سے ہے طنزیہ لہجے میں یہ سوال پوچھتے ہیں کہ ''کیا اُردو ادب میں بھی تحقیق (research) ہوتی ہے؟'' صاحب کا سوال تو شاید ختم ہو گیا تھا مگر وہ ایک لمحہ کے لیے وابستگانِ اُردو کو دعوتِ فکر ضرور دے گئے۔ہم آج تک لوگوں کو اُردو کی اہمیت وفضیلت اور اس کے دائرہ کار سے روشناس نہ کروا سکے۔خیر! یہ ایک الگ بحث ہے اور سوال کچھ اور۔۔۔

مشہور محقق ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی کتاب ''ادبی تحقیق'' میں لکھتے ہیں کہ ''تحقیق زندگی کی ہر سطح پر ایک زندہ معاشرے کی بنیادی ضرورت ہے۔تحقیق خواہ ادب یا سائنس کی ہو یا زندگی کے کسی بھی شعبے کی،اس کی نوعیت اور اس کی منزل ایک ہی ہوتی ہے۔'' اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تحقیق کیا ہے۔تحقیق کے معنی ہیں کسی مسئلے یا کسی بات کی کھوج لگا کر اس کی تہہ تک پہنچنا کہ وہ مسئلہ یا بات اصل شکل اور حقیقتِ مسئلہ میں ہمارے سامنے آجائے۔ شاید حضرتِ اقبال نے اس کا جواب یوں دیا ہے کہ:

کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں

ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

جب انسان خوب سے خوب تر کی جستجو میں نکلتا ہے تو وہ دراصل تحقیق کے ہی مراحل سے گزر رہا ہوتا ہے۔اب اس کیلئے مضمون اور موضوع وغیرہ کی پابندی باقی نہیں رہتی۔

اگر ہم چند لمحوں کے لیے زمانہ قدیم میں جاتے ہیں جس میں لوگوں کے افکار و نظریات کچھ اس طرح کی پائے جاتے تھے۔کسی شخص کے آگے سے کالی بلی کا گزر جانا منحوس

کی علامت ہے۔ زلزلہ کے لیے کہا گیا کہ زمین ایک گائے کے سینگ پر رکھی گئی ہے وہ سینگ بدلتی ہے تو زلزلہ آتا ہے۔ کیا یہ باتیں، یہ نظریات درست ہیں۔ تو ہمارا فوراً جواب نفی میں آئے گا۔ یقیناً ہم کہہ سکتے ہیں کہ قدیم نظریات وافکار پر تحقیق ہو یا سائنس پر، الیکٹرونکس، طبعیات یا ادبیات پر تحقیق کر رہے ہوں، طریقہ کار مختلف ہونے کے باوجود اس کی نوعیت ایک سی ہوتی ہے۔ یعنی بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش اور اصل شکل میں حقیقت وسچائی کی تلاش۔

ڈاکٹر ناگیندر ہندی کے مشہور نقاد ہیں۔ وہ تحقیق میں ادب کی روح ڈھونڈتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''سائنسی تحقیق میں حقائق کی اہمیت ہوتی ہے۔ ادبی تحقیق میں وچار (فکر) کی، سماجی سائنس کی تحقیق میں حقائق اور افکار، دونوں کی۔'' ان کے نزدیک ادبی تحقیق کے لوازم یہ ہیں: ۱۔ نامعلوم کو معلوم کرنا، ۲۔ غیر موجود کو ڈھونڈ لانا، ۳۔ مواد کی تنقیح، ۴۔ فکر کی مدد سے اصول کی تلاش، ۵۔ مناسب اسلوب، ۶۔ بنیادی مقصد علم کے دائرے کی توسیع۔ آیئے ڈاکٹر گیان چند کا خیال بھی سنتے جایئے۔ وہ اپنی کتاب ''تحقیق کا فن'' میں لکھتے ہیں کہ ''سائنس کی تحقیق تجزیاتی ہوتی ہے، بشری علوم کی تاریخی، تجزیاتی یا عملی ہوتی ہے۔ ادب کی تاریخی، سائنسی علوم میں زیادہ تر اشیاء سے سروکار ہوتا ہے۔ بشری علوم اور ادبیات میں انسانوں سے۔''

غرض کہ مختلف شعبہ ہائے زندگی میں ہمیں تحقیق سے واسطہ پڑتا رہتا ہے لیکن ہم نے اپنی معاشرتی مصروفیات وروایات کے پیشِ نظر کبھی اس طرف غور نہیں کیا۔ ہر چند کہ مختصر سطور میں ہم نے ادبی تحقیق کی تعریف واہمیت واضح کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ اس کو چند سطور میں سمونا ناانصافی میں شمار کرتا ہوں۔ صفحہ ہو قرطاس کی کمی کی وجہ سے پوری طرح تحقیق کے مفہوم وموضوع کو بیان نہ کر سکا۔ چہ جائے کہ تحقیق کی اقسام پر نظر ڈالی جاتی۔ بہرحال ادبی تحقیق سے شغف رکھنے والوں کے لیے ''تحقیق کا فن، ڈاکٹر گیان چند'' ایک لاجواب تحفہ ہے۔ جس کے مطالعہ سے آپ کو نا صرف تحقیق بلکہ تحقیق کی اقسام اور ادبی تحقیق کے متعلق خاطر خواہ مواد مل سکے گا۔

مضامین

جلیل احمد	محمد اظہار الحق
بینش شہزادی	حافظہ صبیحہ حسین
حافظ آصف شہزاد	شہباز علی ہادی

ملکی معیشت پر تعلیم کے اثرات

تعلیم کی سب سے سادہ اور جامع تعریف یہ ہے کہ ”تعلیم دراصل کردار میں تبدیلی کا نام ہے۔“

لیکن تعلیم، کردار میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ معیشت پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے اوراس میں کون سی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ یہی اس تحریر کا موضوع ہے۔

تعلیم کی اہمیت مسلمہ ہے کسی بھی قوم کی ترقی کا انحصار اس کے نظامِ تعلیم پر ہے۔ اگر ہم ترقی یافتہ ممالک کا جائزہ لیں تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ان ممالک کی ترقی کا دارومدار تعلیم پر ہے۔ تعلیم نے انہیں شعور بخشا اور ملکی معیشت کو مستحکم رکھنے کا ہنر سکھایا۔

اس معاشی استحکام کے پیچھے ایک طویل داستان چھپی ہوئی ہے جس میں ہمیں عزمِ صمیم، مسلسل جدوجہد اور قومی اُمنگوں کا ترجمان نظامِ تعلیم سب سے نمایاں نظر آتا ہے۔ ہمیشہ وہی قومیں ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہوتی ہیں جن کے تعلیمی ادارے تحقیق (Research) کے میدان میں کارہائے نمایاں سرانجام دے رہے ہوتے ہیں۔ یونیورسٹیز تمام شعبہ ہائے

زندگی میں نئے اُفق تلاش کرنے میں لگی ہوئی ہوتی ہیں۔جس کے نتیجے میں نت نئی ایجادات منظرِعام پر آتی ہیں۔ یہ سائنسی تحقیق انسانی زندگی کے تمام شعبہ جات پر محیط ہے۔زراعت کا میدان ہو یا طب کا شعبہ،الیکٹرانک کی دنیا ہو یا کمپیوٹر کا جہان، گھریلو استعمال میں آنے والی مشینیں ہوں یا کھیلوں سے متعلق آلات،میڈیا کا میدان ہو یا شوبز کی چکا چوند دنیا،آپ کو ہر جگہ سائنس کے کرشمے نظر آئیں گے۔

یہ نت نئی مشینیں اور آلات جو ہمیں ہر شعبہ ہائے زندگی میں نظر آتے ہیں یہ بیش قیمت بھی ہیں اور انسانی زندگی میں ایک انقلاب کا پیش خیمہ بھی۔ یہ ایجادات ان قوموں کے حصے میں آئی ہیں جن کے تعلیمی تحقیقی ادارے (یونیورسٹیز) تحقیق میں مگن ہیں اور مسلسل جدوجہد کے ذریعے وہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہتے ہیں۔ان ترقی یافتہ ممالک نے ان ایجادات کو وسیع پیمانے پر تیار کیا اور دنیا کے کونے کونے میں پہنچا دیا۔جس کے نتیجے میں دنیا بھر کا زرمبادلہ سمٹ کر ان ممالک کے پاس آ گیا اور وہ امیر سے امیر تر ہوتے گئے۔

رہے وہ ممالک جن کی یونیورسٹیز میں تحقیق کا کام ہوتا ہی نہیں یا برائے نام ہوتا ہے اور تحقیقی کام صرف کاپی (copy) پیسٹ (paste) اور ٹائٹل تبدیل کرنے تک محدود ہے وہ ممالک اس معاشی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔معیشت اس وقت مضبوط ہوتی ہے جب آپ کی درآمدات کم سے کم ہوں اور برآمدات زیادہ سے زیادہ ہوں۔

ترقی پذیر یا تحقیق نہ کرنے والے ممالک اپنی ضروریاتِ زندگی کی ہر چیز درآمد کرتے ہیں اور اپنا بیش قیمت زرمبادلہ خرچ کرتے ہیں اور برآمدات نہ ہونے کی وجہ سے روز بروز معاشی ابتری میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارا ملک پاکستان بھی انہی ترقی پذیر ممالک میں شامل ہے۔ ہماری معیشت ڈانواں ڈول ہے۔معیشت کا انحصار بیرونی قرضہ جات پر ہے جس کی وجہ سے آئے روز بجلی، پٹرول، گیس وغیرہ کی قیمتوں میں اضافہ کرنا پڑتا ہے۔عوام مہنگائی کے عذاب میں مبتلا ہے۔

پوری قوم اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے اور ہم اپنے نظامِ تعلیم کو قومی اُمنگوں کے مطابق تبدیل کریں۔ یونیورسٹیز میں تحقیق پر سب سے زیادہ زور دیں۔ تعلیم کا ادنیٰ سا طالب علم ہونے کے ناطے یہ بات واشگاف الفاظ میں کہتا ہوں کہ تحقیق ہمیشہ اپنی زبان میں ہوتی ہے۔ ذہن کے سوتے اسی وقت کھلتے ہیں جب استاد اور شاگرد کی زبان یکساں ہو اور دونوں اس زبان پر دسترس رکھتے ہوں۔ اپنا مافی الضمیر آسانی سے بیان کر سکتے ہوں۔ جب تک یونیورسٹیز میں اعلیٰ تعلیم قومی زبان اردو میں نہیں ہوگی ہماری تحقیق یونہی کاپی پیسٹ (copy paste) پر چلتی رہے گی اور ہم نام نہاد پی ایچ ڈی سکالر پیدا کرتے رہیں گے۔

اگر ہم واقعی اپنے ملک کو ترقی کی شاہراہ پر گامزن کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں مقتدی بننے کی روش چھوڑنا ہوگی اور پوری دنیا کی امامت کے لیے اپنی نئی نسل کو تیار کرنا ہوگا۔ ذہنی غلامی سے نجات پانا ہوگی۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ ہمارے بچے ذہانت میں کسی بھی قوم سے کم نہیں۔ المیہ یہ ہے کہ ہم نے انہیں درسِ غلامی دیا ہے۔ کاش ہم اس روش کو ترک کر دیں اور نظامِ تعلیم اغیار کی بجائے قومی امنگوں کے مطابق ترتیب دیں تو وہ وقت دور نہیں جب پوری دنیا میں پاکستان ایک عظیم ملک کی حیثیت سے پہچانا جائے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ!

قیامِ امن اور نوجوانوں کا کردار

نفسا نفسی اور خود غرضی کے دور میں جہاں خون پانی کی طرح بہایا جا رہا ہو، چہار سو ظلم کا بازار گرم ہو، فحاشی، عریانی، چوری، ڈکیتی، علاقائی لسانی بنیادوں پر قتل عام اور خونریزی سے پورا معاشرہ تباہی کے دہانے پر کھڑا ہو، خوف کے سائے ہمہ وقت منڈلاتے رہتے ہوں، وحشت، بربریت اور نفرتوں کا راج ہو، انسان نما درندوں کی بھرمار ہو، حکمران اقتدار پرست اور رعایا حصولِ معاش میں مگن بے یار و مددگار مرنے کے لیے اپنی باری کا انتظار کر رہی ہو، انصاف بکتا ہو اور مظلوموں کی دادرسی کرنے والا کوئی نہ ہو، تب قوم کی ذرا سی لغزش ظلم کی تاریک رات کو مزید گہری اور طویل کر سکتی ہے۔۔۔

اگر قوم میں ذرا سی ہمت افزائی اور حوصلہ پیدا کیا جائے تو امیدِ سحر کے چراغ ہر سمت روشن ہو سکتے ہیں۔۔۔ یوں تو معاشرے کے ہر فرد پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ خوف و ہراس کی فضا کو ختم کرنے کے لیے کردار ادا کریں لیکن اس صورتِ حال میں نوجوان ہی وہ طبقہ ہے جو اسی ڈوبتی ناؤ کو سہارا دینے نکلتے ہیں۔۔۔ کیونکہ نوجوان ہی ہیں جو طوفانوں سے الجھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ بادِ باراں ہو یا آندھی ان کے حوصلے فلک بوس ہی رہتے ہیں، وہ

جن کے حوصلے آسمان سے زیادہ بلند زمین سے زیادہ وسیع اور چٹانوں سے زیادہ مضبوط ہیں۔ تاریخ اس بات پر شاہد ہے نوجوان ہی کسی بھی انقلابی تحریک کی کامیابی میں ہراوّل دستہ کے طور پر نمایاں رہے ہیں۔۔۔لیکن بد قسمتی سے آج کے دور کا نوجوان عیش وعشرت کا عادی اور نفسانی خواہشات کا غلام ہوتا جا رہا ہے۔۔۔

احساسِ ذمہ داری سے عاری نوجوانوں کی کثیر تعداد بے راہ روی کی شکار ہو رہی ہے۔۔۔اور اس کا ذمہ دار ہمارا سیاسی اور ریاستی نظام ہے۔۔۔سیاسی تنظیموں نے ہمیشہ نوجوانوں کی صلاحیتوں کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ افرادی قوت اور طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لیے نوجوانوں کو مختلف گروپوں میں تقسیم کیا پھر یہی گروپ جرائم پیشہ عناصر کے ہاتھوں کھیلنے لگتے ہیں اور معاشرتی بگاڑ کا سبب بنتے ہیں اس طرح ان کی صلاحیتیں امن دشمن پالیسی کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ نوجوانوں پر مشتمل ایسی کھیپ تیار کی جائے جو انسانی جذبے سے سرشار ہو، باصفا باوفا کردار کے حامل ہوں، برائی کے سامنے معاشرے میں دفاعی حصار لیے ہوئے ہوں، اس پاکیزہ خو اور نیک طینت گروہ کے دل میں دنیا کی چاہت بستی ہو اور نہ مال ومنال کی حرص۔۔۔یہ منصب وجاہ کے طلب گار ہوں اور نہ ہی اپنی شان وشوکت کے متمنی۔۔۔نہ یہ سہانے مستقبل کے خواب تکتے ہوں اور نہ ہی فائیوسٹار ہوٹل کے سپنے آنکھوں میں سجاتے ہوں۔۔۔یہ عشق مجازی کی آلائشوں میں گھرتے ہوں اور نہ ہی جشن ناپائیدار پر فریفتہ ہوتے ہوں۔۔۔ہاں ایسی کھیپ تیار ہو جن کے قلوب لطف وحظ سے بھر جاتے ہوں لیکن لذتوں اور آسائشوں کی بنا پر نہیں بلکہ خلقِ خدا کی خدمت پر۔۔۔یہ بھی غمگین ہوتے ہوں لیکن کسی ناآشنائے وفا کے غم میں نہیں بلکہ انسانیت کے درد میں۔۔۔ اپنے آپ کو تھکاتے اور ہلکان کرتے ہوں لیکن روزگارِ حیات کی تگ و دو میں نہیں بلکہ معاشرے کو سدھارنے کے لیے۔۔۔ان میں جنون ہو لیکن کسی عاشق نامراد کی طرح نہیں

بلکہ اپنے خالق و مالک کی رضا جوئی کے حصول کا جنون۔۔۔ان کے لبوں پر شکوے ہوں لیکن تنگی معاش کے نہیں بلکہ انسانیت کی بے بسی اور کسمپرسی پر چہار سو پھیلی خاموشی پر۔۔۔ غصہ اور طیش انہیں بھی آتا ہوں لیکن اپنی اَنا اور ناک نیچا ہونے پر نہیں بلکہ انسانیت کی بے توقیری پر۔۔۔

درج بالا خصائل کی حامل نوجوانوں کی کھیپ تیار کرنا اگر چہ کسی دیوانے کا خواب لگے لیکن تاریخ کی پیشانی پر نوجوانوں کے اس روشن باب کو کوئی مسخ نہیں کر سکتا کہ جب بطحا کے اُفق پر طلوع ہونے والے چاند نے ہدایت کی روشنی بکھیری اور حقوق العباد پر مشتمل انسانی اقدار سے مزین پروقار معاشرہ تشکیل دیا تھا تو معوذؓ، معاذؓ، اسامہ بن زیدؓ، عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن عباسؓ کی صورت میں لاکھوں نوجوان ایسے تیار ہوئے جنھوں نے اصلاح احوال کے ایسے کارنامے سرانجام دیے جنہیں کوئی فراموش نہیں کر سکتا۔ ایثار و وفا کی ایسی مثالیں دنیا کو امن و آشتی کا گہوارہ بنایا کہ چشم فلک نے وہ منظر بھی دیکھا کہ شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ پر پانی پیتے ہوئے نظر آئے۔۔۔

ظلم اور استحصال پر مبنی اس معاشرہ میں ہم عدل، انصاف، امن اور سکون دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں بھی اس نہج پر نوجوانوں کی تربیت و ذہن سازی کرنا ہوگی جس طرز پر بطحا و یثرب کے جوانوں کی تربیت ہوئی۔۔۔ مجھے روزِ روش کی طرح یقین ہے اس نسل نو کو حقیقی معنوں میں قوم کی قیادت کرنے کے قابل بنانے کے لیے زیادہ تگ و دو نہیں کرنا پڑے گی۔۔۔ انہیں نہ کسی فلاسفر کے فلسفیوں اسکالرز کے بے جان لیکچر اور قصہ گو کی بے لگام داستانوں کے سہارے جنبش دینے کی ضرورت ہے بلکہ ان کو اتنا ہی احساس دلانا مقصود ہے کہ تم ہی جو قوم کے روشن مستقبل کے امین ہو، تمہی سے ساری امیدیں وابستہ ہیں تمہاری ذرا سی غفلت ہمیں تباہی اور بربادی کے راستے پر ڈال سکتی ہے۔

اے ملت کے پاسبانوں تم اگر سہارا نہ بنے تو آنے والی نسل اور تاریخ ہمیں کبھی

معاف نہیں کرے گی۔اے اقبال کے شاہین تیری پرواز میں کوتاہی ہمارے لیے ہمیشہ کی غلامی کا سبب نہ بن جائے۔۔۔ذرا سنبھل خود کو پہچان، منزل سے آشنائی دکھا اور ملک وملت کو سنوارنے کے لیے آگے بڑھ۔۔۔روشن مستقبل کی آس دلا۔۔۔خواہشات کی غلامی کو خیر باد کہہ کر انسانیت کی خدمت کو شعار بنا تا کہ آپ کی وجہ سے پورا معاشرہ سرخرو ہو سکے، غور وفکر کو ذاتیات کی قدر سے رہا کرو اور مایوسیوں کے اندھیروں میں محبت کے چراغ جلاؤ، بس خود کو پہچانو اور اپنی صلاحیتوں قیامِ امن کے لیے وقف کردو تا کہ انسانیت سکھ کا سانس لے سکے۔پھر دیکھنا چرند پرند اور دریا بھی تمہارے اشاروں کے منتظر نظر آئیں گے ہواؤں پر بھی تمہارا ہی حکم چلے گا۔بشرطیکہ تمہارا قول وفعل، جستجو رضا الٰہی اور خلق خدا کی خدمت کے لیے ہو، پھر کوئی بھی اس دنیا کو جنت بننے سے نہیں روک سکے گا، امن اور محبت کا راج ہوگا نفرتیں دم توڑ جائیں گی اگر میری قوم کے نوجوان خود کو پہچان لیں اور اپنی منزل کا تعین کر لیں۔

ہم قلم قرطاس ادبی مجلس، کی طرف سے جی سی یونی ورسٹی فیصل آباد کے شعبہ اردو کے اساتذہ کو "نعتیہ مشاعرے" کے کامیاب انعقاد پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

منجانب: منتظمین قلم قرطاس ادبی مجلس

شعبہ اردو جی سی یو نی ورسٹی فیصل آباد

بینش شہزادی

عبداللہ حسین کے ناول ''باگھ'' کا فنی جائزہ

عبداللہ حسین کا دوسرا ناول ''باگھ'' ان کے پہلے ناول ''اُداس نسلیں'' کے موضوعاتی دائرے سے باہر نکلنے کی کوشش ہے۔ انھوں نے اس ناول میں ایک ایسے کردار کو روشناس کروانے کی کوشش کی ہے جو ساری زندگی جبر کے تسلسل سے اپنے آپ کو آزاد کروانا چاہتا ہے اور اپنے آپ کو ساری دنیا کے سامنے منوانا چاہتا ہے۔ یہ ناول ۲۰۱۲ء میں منظر عام پر آیا۔ یہ ناول صحیح معنوں میں دورِ جدید کے تمام تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ اس ناول میں پہاڑی علاقوں کو مرکز بنا کر بڑی خوبصورتی، سادگی، سلاست اور اختصار کے ساتھ عبداللہ حسین نے کہانی کو بیان کیا ہے۔ اس میں انہوں نے سماجی برائیوں کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیونکہ کوئی بھی معاشرہ اچھائیوں یا برائیوں سے آزاد نہیں ہوسکتا۔ عبداللہ حسین نے پہاڑی علاقوں میں بسنے والے لوگوں کی مقامی زبان کو ہی اظہار کا ذریعہ بنایا ہے جس سے ناول کا پلاٹ خوبصورتی کا حامل گردانا جاتا ہے۔

کسی بھی عمارت کی بنیاد اگر مضبوط ہو تو وہ عمارت وسیع و عریض اور مضبوط عمارتوں میں شمار ہو جاتی ہے۔ اس ناول کا پلاٹ دراصل سادہ ہے جس میں ایک شخص کی کہانی کو

شروع سے لے کر آخر تک بیان کیا گیا ہے۔یعنی ایک شخص کو مرکز بنا کر باقی سارے کردار اس کے گرد گھومتے ہیں۔

اس ناول میں مصنف نے بہت ہی سادہ اور چھوٹے چھوٹے فقروں کا استعمال کیا ہے۔تا کہ پڑھنے میں مشکلات درپیش نہ ہوں اور ایک فقرے کو دوسرے فقرے کے ساتھ باہمی تعاون سے مربوط کر دیا ہے۔یہ ناول وسیع یعنی طویل ہونے کی صورت میں بھی سادہ اور آسان زبان میں ہے تا کہ پڑھنے والے آسانی سے پڑھ سکیں اور سمجھ سکیں۔اس لحاظ سے اس ناول کا پلاٹ بہت ہی اچھا اور جاندار ہے۔

کوئی بھی ناول ہو، افسانہ ہو یا ڈرامہ کرداروں کے بنا مکمل ہی نہیں ہوسکتا۔کوئی بھی کہانی مضبوط اس وقت ہوتی ہے جب اُس کے کردار پوری دلجمعی کے ساتھ اپنے پیشے سے مخلصانہ رویہ کا اظہار کرتے ہیں۔عبداللہ حسین کے اس ناول میں تین مرکزی کردار ہیں اور کچھ ضمنی کردار بھی اپنی ایک اہمیت رکھتے ہیں۔یہ ہی کہانی کو مکمل خوبصورت بناتے ہیں۔ مرکزی کرداروں میں اسد، یاسمین اور باگھ ہیں۔اس ناول کی رو سے:

> ''بے شک حکیم نے یاسمین کے تیز تیز چلتے ہوئے ہاتھوں کے نیچے سر ہلایا۔ جب میں دیکھوں گا کہ سچ مچ کا خطرہ لاحق ہو گیا ہے تو جو کچھ میرے بس میں ہوگا میں کروں گا۔حکیم تولیہ گردن سے اُتار کر کھڑا ہو گیا اور سامنے اسد کو دیکھا اور چونک کر بولا۔''تم یہاں کیا کر رہے ہو۔'' اسد نے جواب دیا پھر بولا۔''یہ بندوق کے حوالے سے کیوں ضد کر رہی ہے؟ حکیم ایک لحظے تک ٹھٹک کر اسد کو دیکھتا رہا۔''

منظر نگاری کسی بھی ناول کو خوبصورت بنانے میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ کوئی بھی ادیب یا مصنف اپنی تحریر میں ایسے حالات و واقعات کو پیش کرتا ہے کہ پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے وہ سارے کا سارا منظر آ جاتا ہے۔منظر نگاری کہلاتا ہے۔

عبداللہ حسین نے اپنے ناول میں بڑی خوبصورتی سے اس صنف کا استعمال کیا ہے۔کبھی بوسیدہ جیل تو کبھی کشمیر کی پُر رونق وادیوں کو بڑے ہی احسن طریقے سے پیش کیا ہے۔

''اسد اور یاسمین پہاڑ کی اوٹ میں پاؤں کے بل بیٹھ جاتے ہیں۔
بجلی گرجنے کی آواز اب آہستہ آہستہ قریب سے آتی ہوئی معلوم ہوتی
ہے اور ساتھ ہی بادلوں کی ہلکی ہلکی گرج سنائی دیتی ہے۔ بارش پہلے
ہی زوردار جھٹکے کے ساتھ تھم جاتی ہے اور ہوا کے جھونکوں کے ساتھ نیم
گیلے جنگل اور پہاڑ کی مخصوص خوشبو چاروں طرف سے آرہی تھی۔''

اس ناول کی رو سے یہاں ادیب نے بہت سی دوسری اصنافِ سخن سے ہمیں وابستہ کیا ہے۔ وہاں ایک صنف مکالمہ نگاری بھی ہے۔مصنف نے بڑے ہی خوبصورت انداز میں کرداروں کا آپس میں مکالمہ کروایا ہے۔اس پیراگراف کی رو سے:

''بارش کے کوئی آثار نہ تھے، اسد نے کہا۔
جب میں باہر نکلا تو دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بادل اتنی خاموشی سے آئیں ہیں۔
یاسمین نے کہا۔''ہاں''
اسد نے پھر پکارا۔''یاس''
''تم یہاں کیوں آتی ہو؟'' یاسمین بولی۔
''بتایا تو ہے'' وہ خاموشی سے بولی۔
''دیکھنے تمہیں۔''

اس ناول میں جذبات کو رومانس سے جوڑا گیا ہے۔کوئی بھی کہانی ہو، ناول ہو جذبات و احساسات کے بنا وہ پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔ ویسے تو عورتیں جذبات کی فہرست میں اوّل ہیں لیکن اس ناول میں مرد (اسد) سے بھی مصنف نے کمال کے جذباتی مکالمے کہلوائے ہیں۔جس ناول یا ڈرامہ وغیرہ میں جذبات کا عمل دخل نہ ہو وہ دورِ جدید

میں کبھی بھی تعریفی سرٹیفکیٹ حاصل نہیں کر سکتا۔ جیسا کہ اس ناول میں ایک جگہ:

''اسد نے یاسمین کا چہرہ پھول کی طرح ہاتھوں میں لیا اور اس کے آبرو کو، گال کو اور ہونٹوں کے کناروں کو چومنے لگا۔۔۔ایک ثانیے کے اندر سرد اور سفید پھڑکتے ہوئے ہونٹوں نے اسد کو اپنے حصار میں لے لیا۔''

اپنی دلی کیفیات کا اظہار ہو یا کسی کی دل آزاری جو چیز سب سے زیادہ قابلِ ستائش ہوتی ہے وہ بولنے والے کی زباں، اس کا سٹائل۔ اس ناول میں بھی عبداللہ حسین نے سادہ اور آساں اسلوب کا انتخاب کیا ہے تا کہ پڑھنے والا بآسانی پڑھ سکے اور سمجھ سکے۔ اسلوب لکھنے والے کی دلی کیفیات کا ترجمان بھی ہوتا ہے۔

''اسی وقت اسد نے دیکھا کہ ہوا میں ایک وسیع محراب کاٹتے ہوئے اچانک بائیں ہاتھ مرغابی کی اُڑان میں ایک نامعلوم سی لڑکھڑاہٹ پیدا ہوئی اور وہ پیچھے رہنے لگی۔''

بات ہو رہی ہے اسلوب کی تو محاورات بھی اس کے اسلوب کے زمرے میں ہی آتے ہیں۔ مصنف نے کہیں کہیں محاورات کے ذریعے مزاح کا عنصر بھی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے تا کہ قاری اس کی رنگا رنگی کو بھی محسوس کر سکے۔ جیسا کہ یہاں مصنف نے پنجابی محاورے کا استعمال کر کے ایک چاشنی سی پیدا کر دی ہے:

''اسد کا باپ کبھی کبھی خود بھی بچوں کے ساتھ کھیل میں شریک ہوتا اور اس محاورے کے استعمال ''چیچو چیک مچولیاں دو تیریاں دو میریاں'' کے ساتھ ہی نعرہ لگنے پر تلاشی کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔''

کیونکہ یہ ناول دورِ جدید کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ لہٰذا اسی وجہ سے مصنف نے انگریزی زبان کا استعمال بھی کیا ہے۔ خاص طور پر پہاڑی علاقے میں جہاں اسد ایک

مشن کے تحت بھیجا جاتا ہے وہاں پر انگریزی الفاظ کے بے دریغ استعمال نظر آتا ہے جو کہ ایک فنی لحاظ سے اچھی کوشش بھی کہا جاسکتا ہے۔اس پیرا گراف کی رو سے:

''فوجی اسد سے مخاطب ہے کہ ریلکس مائی فرینڈ ریلکس۔چار ہفتے تک تمہیں ٹریننگ کیمپ میں رکھوں گا اور پھر تم مکمل پرفیکٹ ہو جاؤ گے۔''

اسلوب ایسا ہونا چاہیے جسے پڑھ کر بوریت کا احساس نہ ہو۔

عبداللہ حسین کا یہ ناول جدید تقاضوں کو پورا کرتا نظر آتا ہے۔طویل ہونے کے باوجود کہیں کہیں بوریت کا احساس ضرور ہوتا ہے لیکن ایک سسپینس کی کیفیت جو کہ شروع سے لے کر آخر تک رہتی ہے وہ اس میں موجود خامیوں کو بھی رد کر دیتی ہے۔مصنف نے اس ناول میں تمام تکنیک کا بخوبی استعمال کیا ہے۔اس کے علاوہ مصنف نے کرداروں سے مکمل انصاف برتا ہے کوئی بھی کردار بلاوجہ زیر استعمال نہیں لایا گیا۔اس ناول میں یہاں انہوں نے معاشرے کی بہت سی برائیوں یعنی سماجی برائیوں کو قلمبند کیا ہے وہاں انھوں نے جیل میں مظلوم لوگوں کا بے جا استحصال بھی دکھایا ہے جو کہ معاشرے کی ایک گھناؤنی شکل ہے۔ اس طرح مصنف نے انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اُجاگر کرتے ہوئے لوگوں کو زندگی کی حقیقتوں سے بھی روشناس کروایا ہے اور کہیں کہیں رنگارنگی پیدا کرنے کے لیے رومانس کا بھی سہارا لیا ہے جو کہ آج کے دور کی ڈیمانڈ بھی ہے۔

اقبال درچشمِ خود

علامہ اقبال نے حیات و کائنات پر جو وسیع اور گہری نظر ڈالی ہے اس سے پیدا شدہ افکار و تاثرات سے ان کا کلام لبریز ہے لیکن علامہ اقبال کی تعلیم و تلقین کا ایک بڑا اہم عنصر ''چشم برخویشتن کشادی'' ہے۔ انسان بدن سے زیادہ ایک نفس ہے اور اس کے ظاہر سے زیادہ اس کا باطن اہم ہے۔

علامہ اقبال کے کلام میں شروع سے آخر تک مسلسل ارتقائے فکر پایا جاتا ہے۔ ابتدا میں وہ زیادہ تر ''فی کل یہیمون'' والا شاعر دکھائی دیتے ہیں۔ گرد و پیش کی جس شے سے متاثر ہوتے ہیں اس کو فن لطیف کا لباس پہنا دیتے ہیں اور خود اپنے اندر جو کیفیت محسوس ہوتی ہے اعلیٰ ہو یا ادنیٰ، صلحا و حکما و عباد کے نزدیک مستحسن ہو یا مشتبہ، سب کو من و عن بہ بانگ دہل، یا لطافت کے لحاظ سے یوں کہیے کہ بہ بانگ نغموں میں منتقل کر دیتے ہیں۔

ہر شاعر اپنی شاعری میں اپنے متعلق بہت کچھ کہتا ہے کہ کبھی براہ راست اور کبھی ''گفتہ آید در حدیث دیگراں'' صدیوں سے ہماری شاعری جس میں ہم فارسی اور اردو شاعری دونوں کو شامل کرتے ہیں۔ خلوص اور حقیقت سے عاری رہی ہے۔ قصائد کا دفتر تو دروغ بافی

کا ایک طومار ہے۔ ان میں تمام صناعی کے محور خوشامد اور مبالغہ ہیں۔ اس طومار میں کہیں فن برائے فن ہے اور کہیں فن برائے زر۔ ایسی شاعری میں شاذ و نادر ہی اپنی زندگی پر حقیقت طلب نگاہ ڈالی گئی ہے۔

علامہ اقبال کی روش شروع سے ہماری روایتی شاعری سے الگ رہی ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری میں شروع ہی سے خلوص نظر آتا ہے۔ جو کچھ وہ محسوس کرتے ہیں وہی کہتے ہیں اور جب تک طبیعت پر کوئی تاثر عاری نہیں ہوتا تھا، وہ نہ تو دوسروں کے تقاضے سے شعر کہتے اور نہ ہی صناعی کے شوق سے۔ شعر کہنا تو درکنار جب تک طبیعت میں خاص کیفیت موجود نہ ہوتی وہ کسی کے تقاضے سے شعر سناتے بھی نہیں تھے۔

فن میں خلوص کا یہ کمال ہمارے شعرا میں شاذ کالمعدوم ہے۔ حیات و کائنات کے متعلق علامہ اقبال کے افکار و تاثرات بہت کچھ بیان ہو چکے ہیں۔ لیکن یہ بیان شسدرہ جاتا ہے اگر اس کے ساتھ ہی اس کا جائزہ نہ لیں کہ حکیمانہ اور الہامی شاعری کے علاوہ ہر صاحبِ کمال شخص وقتاً فوقتاً خود اپنے اوپر نظر ڈال کر اپنی کیفیت کس طرح بیان کرتے ہیں۔

علامہ اقبال کے کلام کا زیادہ تر حصہ حیات و کائنات کے مظاہر و حوادث پر ان کے اپنے نفس کا ردِ عمل ہے۔ ان کے نظریہ حیات ان کی اپنی نفسی کیفیات کے ساتھ وابستہ ہیں۔

علامہ اقبال اپنے متعلق مختلف حالات اور کیفیات میں متضاد باتیں کرتے ہیں، لیکن یہ تضاد مصنوعی یا وہمی نہیں ہوتا۔ علامہ اقبال کو اخیر عمر میں بعض معتقدوں نے عابد و زاہد، عارف و ولی، یا مجددِ عصر سمجھنا ترویج کیا۔ لیکن علامہ اقبال کی طبیعت میں اس قدر شناسی نے کچھ مغالطہ پیدا نہ کیا وہ آخر تک معتقدوں کے اس مغالطے کو رفع کرنے کی کوشش کرتے رہے اس پوجا سے بچنے کے لیے اپنی کمزوریوں کو طشت از بام کرتے رہے۔ اس پر بعض معتقدوں نے یہ نظریہ قائم کیا کہ یہ عارفانہ کسرِ نفسی کا مظاہرہ ہے۔

علامہ اقبال نے اپنے اندازِ تفکر و تاثر کو کس طرح بیان کیا ''بانگِ درا'' میں ''گل رنگیں''

کومخاطب کرتے ہوئے اپنی فطرت کا خارجی فطرت سے مقابلہ کیا ہے۔سوز و ساز، جوترقی یافتہ کلام میں ان کا موضوع خاص بن گیا اور جس کے لیے آخر میں انہوں نے عشق کی اصطلاح کومخصوص کر لیا، وہ ابتدا میں بھی موجود ہے۔اس لیے کہ اقبال کی فطرت کا اصلی جوہر یہی تھا جو ارتقا کی ہر منزل میں نمایاں ہے۔

پھول کومخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تو بڑا مطمئن خود مست اور بے پروا معلوم ہوتا ہے۔زندگی کی شورش اور کشاکش سے تجھے فراغت حاصل ہے جو میرے لیے باعثِ رشک ہے۔

تو شناسائے خراش عقدہ کشا مشکل نہیں
اے گل رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں
زیب محفل ہے شریک شورش محفل نہیں
یہ فراغت بزم ہستی میں مجھے حاصل نہیں
اس چمن میں نہیں مرا پر سوز و ساز آرزو
اور تیری زندگانی بے گداز آرزو

آگے چل کر وہ اس اطمینان کو قابلِ رشک نہیں سمجھتے ان کے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے جسے وہ پورے یقین کے ساتھ پیش نہیں کرتے کہ تو مطمئن ہے اور میں مثال جو پریشان، بظاہر بےاطمینانی تو خواہ مخواہ کی سزا معلوم ہوتی ہے۔لیکن اس کا بھی احتمال ہے کہ انسان کا نصب العین جس انداز کی جمعیت خاطر ہے وہ اضطراب وجستجو اور سوز وساز ہی کے وسیلے سے پیدا ہوتی ہے اور شاید حکمت کا سرچشمہ یعنی یہی بےتابی ہو:

یہ پریشانی مری سامان جمعیت نہ ہو
یہ جگرسوزی چراغ خانۂ حکمت نہ ہو

''خفتگان خاک'' سے جو سوالات پوچھے ہیں وہ اقبال کی اپنی زندگی کا نقشہ ہے۔

انداز استفہام میں اپنی تمام دلی آرزو میں بھی بیان کر دی ہیں لیکن یہ دور حیرت وتذبذب ہے۔ابھی علامہ کو دانائے راز ہونے کا احساس پیدا نہیں ہو حیات بعد الموت کے متعلق کوئی یقینی تصور نہیں۔زنداں سے اسرار کی گرہ کشائی نہ ہوئی تو اب اس دنیا کی طرف گئے ہوئے لوگوں سے پوچھتے ہیں:

تم بتا دو راز جو اس گنبد گرداں میں ہے
موت ایک چبھتا ہوا کانٹا دل انسان میں ہے

اپنے وطن اور اپنی ملت میں اخوت اور وحدت کا فقدان ان کے لیے سوہان روح ہے۔جب تک اس وطن میں وحدت مقصد اور صورت پیدا نہ ہو یہ غلام ہی رہے گا۔اس شدت احساس نے ان سے وطنیت پر ولولہ انگیز نظمیں لکھوائیں۔ابھی تک ان کا یہی خیال تھا کہ مذاہب تو نفاق انگیزی ہی پر تلے ہوئے ہیں۔اگرچہ مذہب کی حقیقت افزونی محبت ہے، لیکن ہندوستان میں مذاہب اور مذاہب کے فرقوں اور ذات پات نے خلیجیں اور نفرت پیدا کر رکھی ہے۔علامہ اقبال کا حساس دل اس سے جلتا ہے اور مایوسی میں خودکشی کو آمادہ کرتا ہے:

چل رہا ہوں، کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیط آب گنگا تو مجھے
سرزمین اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا، یاں تو اک قرب فراق آمیز ہے

علامہ اقبال نے جو لائحہ عمل ابتدا میں اپنے لیے تجویز کیا تھا آخر تک اس پر عمل کیا ہے۔اسلامی فرقوں کی لا طائل بحثوں میں آپ کبھی بھی نہیں پڑے۔فقیہانہ مناظرہ انہوں نے کبھی نہیں کیا اور بے شمار لا حاصل پرانی داستانیں، جو مسلمانوں کا سرمۂ ادب اور گنجینۂ مواعظ بن گئی تھیں ان کو علامہ نے یک سر ترک کر دیا۔

علامہ نے اپنے کلام میں جا بجا اپنی سیرت اور میلانات کا تجزیہ کیا ہے، لیکن کچھ

نظمیں ایسی ہیں جن میں عام محاورے کے مطابق اپنا کچا چٹھا پیش کر دیا ہے۔

''بانگِ درا'' میں زاہد اور رندی کے عنوان سے جو نظم ہے اس میں بظاہر ایک مولوی صاحب اقبال کے اندر متضاد نما میلانات دیکھ کر اور اس کی سیرت نا قابلِ فہم سمجھ کر، معترضانہ انداز میں بات کر رہے ہیں۔ لیکن علامہ اقبال نے مولوی صاحب کے بیان میں سے کسی بات کی تردید نہیں کی۔ مولوی صاحب نے جو کچھ کہا وہ نوجوان اقبال کی زندگی میں کلاً یا جزاً موجود تھا۔ علامہ اقبال کے خلوص اور صاف گوئی کو دیکھیے سب کچھ سن کر مولوی صاحب سے اتفاق ہی کیا کہ واقعی یہ سب باتیں یک جا میری زندگی اور میری طبیعت میں موجود ہیں۔

کہتے ہیں میں خود بھی اپنی حقیقت سے شناسا نہیں ہوں:

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے

کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

علامہ اقبال خود اپنی سیرت کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ اس کا ثبوت جا بجا ان کی آرزوؤں سے ملتا ہے اور یہ نفسانی حقیقت ہے کہ ہر سیرت کی مخصوص تعمیر مخصوص آرزوؤں سے ہوتی ہے۔ ہر انسان کی اصلیت وہی ہے جو اس کی آرزوؤں کی ماہیت ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ خارجی حوادث اور باطنی مزاحمتیں ان میں بعض کو وجود کا جامہ نہ پہنا سکیں۔

تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں

مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

ستم ہو کہ ہو وعدہ بے حجابی

کوئی بات صبر آزما چاہتا ہوں

یہ جنت مبارک ہے زاہدوں کو

کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں

اشفاق احمد کے افسانے ''قصاص'' کا تجزیہ

ادب کی کسی بھی صنف سے متعلق کوئی بھی فن پارہ اپنی زبان یا لسانی اہلیت و اہمیت پر چلتا ہے۔یعنی تخلیق کار اپنے جذبات واحساسات اور خیالات وواردات قاری تک پہنچانے کے لیے کس قسم کا تکنیکی عمل وجود میں لاتا ہے۔ ہر وہ تخلیق پسندیدگی کے مراحل ضرور طے کرتی ہے جس کی زبان قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کی اہلیت رکھتی ہو۔اس اعتبار سے اپنی تحریر کو طلسماتی انداز میں پیش کرنے کے حوالے سے مصنف ''طلسم ہوش افزا'' یدطولیٰ رکھتے ہیں۔ادب کی مختلف النوع اصناف میں اشفاق احمد نے طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی ہر ایک تصنیف ایک الگ اور ممتاز ومنفرد مقام کی حامل ہے،مگر ''طلسم ہوش افزا'' کسی عجوبہ سے کم نہیں۔

''طلسم ہوش افزا'' کا موضوع سائنس فکشن ہے۔سائنس لاطینی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی حقائق کا اصلی شکل میں باقاعدہ مطالعہ کرنا ہے۔

"The branch in which we study the living and non-living organism and their interaction with their environment.

Science is based on observation and experiment."

جبکہ اس کے برعکس افسانہ جھوٹی باتوں کا ایک پلندہ ہوتا ہے۔ افسانے کے معنی انور جمال کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

''حقیقت کا نقیض، جھوٹ، جھوٹی کہانی، بات کو زیبِ داستاں کے لیے بڑھانا۔''

سائنس چیزوں کی حقیقت بتاتی اور ثابت کرتی ہے۔ جبکہ افسانہ حقیقت کا نقیض ہے۔

دو متضاد چیزوں کو لفظوں کے چمکدار موتیوں میں پرو کر ایک نایاب مالا تیار کرنا اشفاق احمد کا خاصہ ہے۔ ''طلسم ہوش افزا'' ایک درجن افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ہر ایک افسانہ دوسرے کی نسبت زیادہ محیر العقول ثابت ہوتا ہے مگر اس طالب علمانہ سعی میں افسانۂ اوّل ''قصاص'' (قصاص کا معنی ہے بدلہ لینا یعنی جان کے بدلے جان اور مال کے بدلے مال) کے تجزیہ کی کوشش کی گئی ہے۔

''قصاص'' میں اشفاق احمد نے اس دور کی طبقاتی تقسیم کو بھی واضح کیا ہے۔ وڈیروں اور سرداروں کے اخلاق رذیلہ کو بھی بیان کیا ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ طرزِ تکلم کا کس قدر گھٹیا انداز اپناتے تھے۔ نوکر، مزدور اور محافظ امراء کی بدزبانی اور گالیاں سننے کے باوجود بھی سر جھکانے اور ان کی ہاں میں ہاں ملانے پر مجبور تھے۔ دینو اور صابو کا اپنے ملازم دارا کے ساتھ طرزِ کلام دیکھیے:

''صابو نے کہا ''اوئے داریا! تمہارے گھرانے میں بھی کبھی ہوئی ایسی محبت، ہم بھائیوں جیسی۔۔۔ میرے دو نانوں میں ایسی محبت ضرور تھی۔۔۔'' دینو نے چٹک کر کہا ''لکھ لعنت اوئے داریا!۔۔۔'' دارا نے کلاشنکوف پہ پھونک مارے ہوئے ہولے سے کہا ''ٹھیک

ہے بھئی چوہدریا،ٹھیک ہے۔''

یہ افسانہ سائنس فکشن کا ایک شاہکار ہے۔اس کے اندر دو کہانیاں متوازی چلتی ہیں۔ایک کہانی پہلے زمانے کی ہے جب سواری کے لیے اونٹ اور گھوڑے استعمال ہوتے تھے۔جبکہ دوسری کہانی کا تعلق زمانۂ جدید سے ہے جس میں سفر کے لیے گاڑیاں استعمال ہوتی ہیں۔

پہلی کہانی میں مشکی نٹنی اپنے مالک کے قتل کا بدلہ لیتی ہے۔یہ بات تو سمجھ میں آنے والی ہے کیونکہ جانور کو اپنے مالک کی بھی پہچان ہوتی ہے اور مالک کے دشمن کی بھی،مگر دوسری کہانی میں لینڈ روور اپنے مالک کے قاتلوں کو قتل کرتی ہے جو کہ ایک محیر العقول بات ہے،مگر ایسا ہو جائے تو پھر؟ بدلہ لینے کا انداز دونوں کا ایک ہے۔قاتلوں کی تعداد بھی برابر ہے۔پہلی کہانی میں مشکی نٹنی نے ایک قاتل کو سم جوڑ کر مارا ہے۔دوسرے نے بھاگنے کی کوشش کی ہے لیکن نٹنی نے حملہ کر کے اس کی ریڑھ کی ہڈی کو ریزہ ریزہ کر دیا ہے۔

جبکہ دوسری کہانی میں لینڈ روور نے بھی ایک قاتل کو بمپر جوڑ کے مارا ہے۔دوسرے نے بھاگنے کی کوشش کی ہے مگر لینڈ روور نے اس کی ریڑھ کی ہڈی کا چورا چورا کر دیا ہے۔

''ایک،دو،تین اور جب اس نے گرے ہوئے شخص کے سر پر چوتھا وار کیا تو اس کا بھیجا دور دور تک پھیلے ہوئے کھنگروں سے جا کر چپک گیا۔''

''اچھل کر بمپر جوڑ کر ٹکر ماری جو کچھ دیکھے،سوچے،بولے بغیر وہیں ڈھیر ہو گیا۔دوسرے نے بھاگنے کی کوشش کی۔۔۔اگلا اور پچھلا پہیا سان کی طرح چلا دیا۔ریڑھ کی ہڈی کا چورا کرنے کے بعد۔''

اسلوب

انگریزی لفظ Style کی جگہ لفظ ''اسلوب''،مستعمل ہے۔کسی بھی محرر کا طرزِ تحریر یا متکلم کا طرزِ کلام اس کا اسلوب کہلاتا ہے۔اسلوب مصنف کی شخصیت کا عکس ہوتا ہے

جو الفاظ کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ اسلوب مصنف کے ذہنی اور جذباتی تجربے کا خارجی روپ ہے۔

افسانہ ''قصاص'' میں اشفاق احمد کا اسلوب نہایت شاندار ہے۔ افسانے کا اسلوب سادہ اور دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ انگریزی، پنجابی، ہندی اور عربی الفاظ کے ساتھ بھی مزین ہے۔ افسانے کی زبان اور مکالمے اس ماحول کی بھرپور عکاسی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بعض کردار گالی گلوچ کرتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ محاورات، مکالمہ نگاری، تشبیہات اور الفاظ کا استعمال بڑے خوبصورت انداز میں کیا گیا ہے۔

''قصاص'' میں منظر نگاری کا ایک منفرد انداز اختیار کیا گیا ہے۔ کسی بھی منظر کی تصویر کشی میں مہارت تامہ کا تمغہ اشفاق احمد کے صدرِ ذی قدر پر سجا ہی بھلا محسوس ہوتا ہے۔ وہ واقعہ کو کچھ ایسے حسین انداز میں بیان کرتے ہیں کہ قاری یوں محسوس کرتا ہے وہ خود اس موقع پر موجود تھا اور یہ سارا معاملہ اس نے بچشم خود ملاحظہ کیا ہے۔ مشکی نٹنی جب سانڈنی سواروں پر حملہ کرتی ہے اشفاق احمد کی منظر نگاری دیکھیے:

> ''اس نے دونوں پچھلے سموں پر اپنا پہاڑ جیسا بدن تول کر بائیں طرف کمر لچکائی اور دائیں طرف گردن میں خم ڈال کر آسمان بھر اونچی اگلی ٹانگوں کے ساغری سم جوڑ کے سامنے والے شخص پر تین ٹن کا دوموہا ہتھوڑا اچلا دیا۔''

اشفاق احمد کے اسلوب کا خاصہ یہ ہے کہ آپ الفاظ کے موتیوں کو تحریر کی مالا میں ایسے انوکھے انداز سے پروتے ہیں کہ قاری جملہ پڑھتے ہی محظوظ بھی ہوتا ہے اور انگشت بدنداں بھی۔ ساموا اور دینو جس عورت کے عاشق تھے اس کا تعارف بابا صاحبا کی تحریر پر تاثیر میں دیکھیے:

> ''یہ عورت ذات کی بورئن تھی اور سانڈے کا تیل بیچتی تھی۔ سردارنیوں

کی مالش کرتی تھی اور سرداروں سے مالش کرواتی تھی۔''

بابا صاحبا کے فن تحریر کا کمال یہ ہے کہ آپ نے اپنے اس افسانے میں تہذیب و معاشرت کی بھرپور عکاسی کی ہے۔لوگوں کا آپس میں طرزِ کلام نکھر کر سامنے آتا ہے۔عموماً بڑے لوگ مہذب ہونے کی بجائے ناشائستہ زبان کا استعمال کرتے ہیں۔جیسے:

''سبھی گولی کے لائق ہو۔''

''اوئے روئیں اپنی مکینک گری کو گدھے۔''

''لکھ لعنت اوئے داریا۔''

جزئیات نگاری

جزو کا معنی ہے ٹکڑا یا حصہ۔جزئیات نگاری سے مراد ہے کسی بھی وقوع پذیر ہونے والے کام کے ایک ایک حصے اور ٹکڑے کو وضاحت و صراحت سے کھول کر قاری کے سامنے بیان کرنا''قصاص''میں جزئیات نگاری کا عنصر بھی موجود ہے۔صابو اور دینو کا حلیہ دیکھیے:

''ایک سے رنگ کے کپڑے پہنتے، ایک جیسی سندھی ٹوپی اوڑھتے، دونوں پھڈی جوتی اور لانگڑ کھینچ کے چادر باندھتے تھے۔ دونوں ہونٹوں پر ملائی مل کے۔۔۔آنکھوں میں لال سرمہ ڈالتے تھے۔''

رومانویت کا رنگ

خیال و خواب کی گل پوش وادیوں میں کھوئے رہنا اور تصور جاناں کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھنا رومانویت کہلاتا ہے۔رومانویت کا علاقہ چونکہ تخیل سے ہے اس لیے کسی بھی صنف ادب (ناول، ڈرامہ، داستان، افسانہ) میں اس کے عنصر کو شامل کرنا کچھ زیادہ مشکل سے دوچار ہونا نہیں مگر سائنس فکشن کی تحریر پر رومانویت کا رنگ چڑھانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں کیونکہ سائنس تخیل نہیں تجربے کی متقاضی ہے، مگر اشفاق احمد کا طبعی میلان ان کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ سائنس فکشن کی تحریر کو بھی رومانویت کے رنگ میں رنگنے

کے علاوہ اپنی تشفی نہیں کر پاتے۔

''کرتار سنگھ بلٹو ہٹے کی گر جی گراں کے ویدوں کی لڑکی سے یاری تھی
جس کو سوائے اس کے جانی یار گلزار کے اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ ویسے
اس کی ماں بھی اس بھید سے واقف ہو گئی تھی۔۔۔''سچ بتا کرتاریا وہ
کون ہے جس کو تو جپھیاں ڈالتا رہتا ہے۔''

پلاٹ

اس افسانے میں دو کہانیاں متوازی چلتی ہیں۔ پلاٹ نہایت ہی جاندار ہے۔ پوری کہانی میں کہیں بھی جھول نظر نہیں آتا بلکہ کہانی پڑھتے ہوئے قاری کی تشنگی میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ کسی بھی افسانے کی کامیابی کے لیے اس کے پلاٹ کا مربوط اور منظّم ہونا ضروری ہے اور یہ خوبی ''قصاص'' کے پلاٹ میں بدرجہ اُتم موجود ہے۔ اس افسانے کے تمام کردار جاندار ہیں اور مصنف نے ان کے منہ سے زمان و مکان کی مناسبت سے مکالمے نکلوانے کی بھرپور کوشش کی ہے جس میں وہ پوری طرح کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ صرف کرتار سنگھ کے کردار میں ایک جگہ جھول ہے جہاں وہ اپنی ماں کی بات سنی اَن سنی کر دیتا ہے اور سفر کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ الغرض اس افسانے کے تمام کردار ہمارے معاشرے کے عکاس اور غماز ہیں اور حقیقت کا پرتو ہیں۔

ترک شاعر محمد عاکف ارصوے

مسلمانوں کی خلافت اور سلطنت عثمانیہ کے اختتامی دور میں مغربی نوآبادیاتی قوتوں کے خلاف ترکوں میں جذبہ ءحریت کا سوز جگانیوالے محمد عاکف ارصوے 1920ء کو کستمو کی نصر اللہ مسجد میں دیئے گئے تاریخ ساز خطبے کی وجہ سے ترک قوم کے نمائندہ شاعر اور رہنما بن کر ابھرے۔ ان کی اس تقریر نے ترکوں میں وہ جذبہ حب الوطنی پیدا کیا کہ وہ مغربی استعمار کے سامنے اسلحہ بردار ہو کر سینہ سپر ہو گئے۔ یہ ایمان افروز تقریر اس وقت کے مشہور ترک جریدے ''سبیل الرشاد'' میں شائع ہوئی تو ملک کے کونے کونے میں پھیل گئی، اسے بطور پمفلٹ فوجیوں میں تقسیم بھی کیا گیا جس نے ترکوں کو جنگ آزادی لڑنے کا نظریہ اور جیتنے کی کامرانی سوچ مہیا کی۔

محمد عاکف ارصوے 20 دسمبر 1873ء میں استنبول میں پیدا ہوئے، آپ کے والد طاہر آفندی ایک مدرسے میں استاد تھے، انہوں نے آپ کا نام رغیف رکھا تھا کہ جو کہ عربی زبان کا لفظ ہے لیکن ترکی میں یہ لفظ معروف نہ ہو سکا اور آپ کا نام عاکف ہی پکارا گیا، آپ کا تعلق مذہبی گھرانے سے تھا، نوجوانی کی عمر میں آپ کے والد انتقال کر گئے، یہ

سانحہ ان کے لیے کم نہ تھا کہ اسی دوران آپ کے گھر میں آگ لگ گئی اور گھر مکمل طور پر تباہ ہوگیا جس کے باعث آپ نے تعلیمی سلسلہ منقطع کر دیا اور ملازمت کرنے لگے، آپ نے نوجوانی میں اس سخت ترین مشکل کا سامنا کیا اور ملکیہ بیطار مکتبی (علاج مویشیاں کی درسگاہ) میں داخلہ بھی لیا اور 20 سال کی عمر میں اپنی تربیت مکمل کر کے اعزازی سند حاصل کی۔

1893ء میں آپ کو سرکاری ملازمت مل گئی اور آپ نے اناطولیہ میں مختلف مقامات پر متعددی امراض پر تحققات بھی کیں، اپنے مذہبی پس منظر کے باعث وہ مسلمانوں کے زوال پر بہت پریشان تھے اس لیے انہوں نے اس عرصے کے دوران مختلف مساجد میں خطبے بھی دیئے اور منبر کے ذریعے عوام میں شعور اجاگر کرنے کی کوشش بھی کی، ان کے ہم عصر ادیبوں رضا زادہ محمود اکرم، عبدالحق حامد اور شہاب الدین کے ہمراہ انہوں نے ''مدافع ملی حیاتی'' کے جریدے ''سبیل الرشاد'' میں کام کیا، بعد میں انہوں نے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور آزادی کی جدوجہد کا حصہ بن گئے۔ عاکف ارصوے کی شاعری اور مضامین ''صراط مستقیم'' نامی جریدے میں شائع ہوتے رہے۔

ترک جنگ آزادی کی جدوجہد کے دوران آپ نے ایک نظم ''استقلال مارشی'' لکھی جسے بہت زیادہ پذیرائی ملی۔ اس نظم نے ملک کے لوگوں میں آزادی کی تڑپ کو بے قرار کر دیا اور وہ میدان جنگ میں بے خوف وخطر کود پڑے۔ اسے اتنا سراہا گیا کہ جمہوریہ ترک کے قیام کے بعد 12 مارچ 1921ء کو مجلس کبیر ملی نے اسے قومی ترانے کی حیثیت دی اور اسے 100 ترک لیرا کے نوٹ پر بھی چھاپہ گیا یوں عاکف ارصوے ترکی کے نمایاں شاعر ہونے کے اعزاز سے سرفراز ہوئے۔

محمد عاکف ارصوے نا صرف جذبہ حب الوطنی کے قائل تھے بلکہ آپ امت وحدت کے عظیم نظریہ سے بھی فکر علامہ محمد اقبال کے فلسفہ سے سرشار تھے اور وہ ملکوں کی تقسیم

کو اسلام کی تقسیم کے خلاف سمجھتے تھے۔ وہ خلافت اسلامیہ کی تاریخ سے شناسا تھے، مگر امت مسلمہ کی حالت زار پر نوحہ کناں بھی تھے۔ وہ جمہوریہ ترک اور حب الوطنی کے جذبے کے پیچھے نوآبادیاتی مغربی استعمار کی سازشوں کی ناکامی کا خواب دیکھتے تھے کہ جس کا خوبصورت اظہار ان کی نظم ''اذانیں'' سے مکمل جھلکتا ہے۔

یہ اللہ کی آواز ہے
جو آسمانوں کو معمور کر دیتی ہے
کیا اس آواز کے لیے یہ کوئی بڑی بات ہے؟؟
کہ یہ ساری دنیا کو ہلا دے۔

محمد عاکف ارصوے روایتی مشرقی علوم میں زبردست مہارت رکھتے تھے، انہوں نے اپنے والد سے عربی اور فارسی زبان کی تعلیم حاصل کی تھی اور اپنی سرکاری ملازمت کے دور میں ہی دوستوں کے کہنے پر انہوں نے فرانسیسی زبان بھی سیکھی۔ ان کا ادبی کارنامہ ''صفحات'' ہے جو نظموں پر مشتمل مجموعہ کلام ہے، اس کلام میں 44 نظمیں شامل ہیں جس میں سب زیادہ لافانی حیثیت ''استقلال مارشی'' کو ہے۔ سلیمانیہ کورسوندہ (سلیمانیہ کے منبر پر)، حقن سیس لری (صدائے حق)، فاتح کورسوسوندہ (فاتح کے منبر پر)، خاطرہ لر (یادداشتیں)، گولگہ لر (سائے)، کستمونونصر اللہ کورسوسوندہ (کستمونونصر اللہ کے منبر پر) اور قرآن دن آیت وحدیث لر (آیات واحادیث از قرآن) ان کے اہم ادبی شہ پاروں میں شامل ہیں، خاطرہ لر میں انہوں نے ایک نظم ''صحرائے نجد سے مدینہ تک'' تک لکھی ہے جس میں انہوں نے حضور اکرم ﷺ سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے، اسلامی ادبیات میں اس نظم کو بہت زیاہ اہمیت اور پذیرحاصل ہے، ترکی میں قوم پرستی کی وجہ سے عاکف اصوی کی آواز پر زیادہ دکان نہیں دہرا گیا اور رہی سہی کسر زبان کے رسم الخط نے پوری کر دی جس کی وجہ عاکف کی انقلابی شاعری لوگ کم آشنا رہے، 1944ء میں ان کے داماد عمر رضا طغرل نے ''عاکف

ارصوے کے مجموعہ کلام کو ''صفحات'' کے نام سے لاطینی رسم الخط کی جدید ترکی میں شائع کیا جس کی بدولت ان کلام مقبولیت کی بلندیوں پر پہنچ گئے۔

ترکوں نے آزادی حاصل کر لی لیکن محمد عاکف ارصوے حکومت کی پالیسیوں سے دل شکستہ ہوئے۔وہ ترک جو کبھی اپنے اندر امت وحدت کو سمیٹے ہوئے تھا،مغرب کی جدیدیت کا شکار ہوگیا جس پر آپ نے اس کی مخالفت کی تو آپ کو پھانسی کا حکم سنا دیا گیا۔لہٰذا آپ نے 1925ء کو ہجرت میں عافیت جانی اور مصر کے دارالحکومت قاہرہ میں کوچ کر گئے اور 11 سال تک اپنے محبوب وطن میں نہ لوٹ سکے۔لیکن جب آپ لبنان کے دورے پر گئے تو آپ کو ملیریا کے مرض نے جکڑ لیا اور 1936ء کو اپنی وفات سے چھ ماہ پہلے استنبول لوٹ آئے مگر مرض نے انہیں سنبھلنے نہ دیا اور وہ 27 ستمبر 1936ء کو جہان فانی سے انتقال کر گئے۔انہیں استنبول کے ادرنہ قاپی قبرستان شہیداء میں سپرد خاک کیا گیا۔وہ ترکی تاریخ کی پہلی شخصیت تھے جن کی آخری رسومات پر قومی ترانہ بجایا گیا۔

قلم قرطاس کے اگلے شمارے سے نئی کتابوں پر تبصروں
کے سلسلے کا آغاز کیا جا رہا ہے۔
تبصرے کے لیے دو کتابوں کا بھیجنا ضروری ہے۔

منتظمین قلم قرطاس ادبی مجلس

شعبہ اردو جی سی یو نی ورسٹی فیصل آباد

افسانے

حافظ محمد حیاتؔ	مہوشؔ نواز
عائشہ مشعل	مہوش حبیب
ناصرؔ علی وارثی	

لہو کا قرض

صبح سویرے آسمان پہ آزاد فضاؤں میں اڑنے والے پرندوں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر اکرم سوچ رہا تھا کہ کاش! اس کو بھی ان جیسی آزادی نصیب ہوتی۔ اکرم کی عمر ابھی مشکل سے آٹھ سال تھی وہ ایک ہوٹل پہ کام کرتا تھا اسے کسی گاہک سے بھی بات مالک سے پوچھ کے کرنی پڑتی تھی۔ وہ ابھی انہی سوچوں میں ہی گم تھا کہ اس کی امی کی آواز اس کے کانوں میں پڑتی ہے۔

''بیٹا ! جلدی نیچے آؤ، کام پہ جاؤ دیر ہو رہی ہے پھر مالک غصہ کرے گا اور تنخواہ میں سے پیسے کاٹ لے گا۔''

اکرم تابع فرمان تھا نیچے آ کر بہن کے ساتھ مل کر اپنے معذور والد کی چار پائی اندر کمرے میں ڈالتے ہیں کیونکہ اس کے والد معذور ہو چکے ہیں۔ ان کے پاس چھوٹے سے صحن کے علاوہ ایک ہی کمرہ تھا جو ان کی کل کائنات ہے کمرہ بھی اتنا چھوٹا کہ جہاں سانس لینا بھی دشوار مگر اس کی ماں نے شکر ادا کرتے ہوئے زندگی اسی چھوٹے سے گھر میں گزار دی تھی۔

اکرم کا والد ایک فیکٹری میں ملازم تھا محنتی اور دیانتدار اور سب سے بڑھ کر غیرت

مند انسان تھا یہی صفات اس فیکٹری کے مالک کو اچھی لگتی ہے وہ اسے اپنے ساتھ ہمیشہ رکھتا تھا ایک دن مالک کے ساتھ اکرم کا والد جارہا تھا کہ راستے میں پولیس کی وردیوں میں ملبوس ڈاکو ان کو روکتے ہیں ہر چیز لوٹنے کے بعد وہ گاڑی سے ان کو اتارتے ہیں لیکن اکرم کا والد مزاحمت کرتا ہے وہ ڈاکوؤں سے اکیلے لڑتا ہے اور چودھری صاحب ان کو اس مشکل گھڑی ہمارے ملک کے نام نہاد لیڈروں کی طرح میدان میں تنہا چھوڑ کر فرار ہو جاتا ہے۔ ڈاکوؤں نے اکرم کے والد کی دونوں ٹانگیں توڑ دی اس دن سے چارپائی سے ہی لگ کے رہ گئے۔

چارپائی کمرے میں ڈالنے کے بعد اس کی ماں اسے کہتی ہے ''اسلم چاچا کی دکان سے کچھ آٹا جلدی سے لے آؤ۔''

اسلم چاچا، اپنے پہلے قرض کا تقاضا کرتے ہوئے کہتا ہے کہ بیٹا! اپنی امی کو بلاؤ۔

اکرم کی ماں: اسلم بھائی! میں آج آپ کے پیسے لوٹا دوں گی کیونکہ شیخ صاحب کے گھر سے مجھے کچھ پیسے مل جائیں گے آپ کو پتا تو ہے کہ اکرم کے ابا کی دوائی کا خرچ، مکان کا کرایہ، بڑھتے ہوئے بجلی و گیس کے بل اور سب سے بڑھ کر کمر توڑ مہنگائی نے تو جینا مشکل کر دیا ہے۔ (یہ باتیں سننے کے بعد اسلم اس کو آٹا دے دیتا ہے)

وہ گھر آ کے جلدی سے ناشتہ بناتی ہے اور پھر لوگوں کے گھروں میں جا کے گھر کے کام کاج کر کے اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ پالتی ہے۔ وہ سارا دن در در کی ٹھوکریں کھاتی ہے اور شام کو گھر جاتے اپنے وعدے کے مطابق اسلم بھائی کو اس کے پیسے لوٹا دیتی ہے، وہ اسی کی دکان پر کچھ سودا سلف لینے کے لیے ٹھہرتی ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ ہمارے محلے کے پاس سے جو شہر کی بڑی سڑک گزرتی ہے اس کی تعمیر کی منظوری ہو گئی ہے یہ سن کر وہ خوش ہوتی ہے کہ اسے اپنے گھر کے قریب ہی روزگار مل جائے گا۔

چند ہی دنوں میں سڑک کی تعمیر کا آغاز ہو جاتا ہے اور بھاری مشینری وہاں لائی جاتی ہے۔ اس سارے کام کا ٹھیکیدار سلمان ہوتا ہے۔ اکرم کی ماں اسے ہمدرد اور اچھا انسان سمجھ

کر اس کے پاس کام کے لیے جاتی ہے کہ مجھے یہاں مزدوری مل جائے، میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، شوہر معذور ہے اور میرے سوا بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے کوئی سہارا نہیں ہے۔

آپکی بڑی مہربانی ہوگی ٹھیکیدار صاحب!

اچھا اچھا، تم کل سے یہی کام پہ آجانا (ٹھیکیدار سلمان اپنی ہیبت ناک آواز میں اسے جواب دیتا ہے۔)

وہ دعائیں دیتی ہوئی گھر کو لوٹتی ہے اگلے دن وہ کام پر جاتی ہے اور باقی مزدوروں سے بڑھ کر کام کرتی ہے اور شام کو جب اپنی مزدوری کے پیسے لینے کے لے جاتی ہے تو ٹھیکیدار سلمان مزدور کو مزدوری دینے کے وقت حسبِ عادت وہاں سے غائب ہوتا ہے۔ وہ بیچاری صبر کر کے وہی سے شیخ صاحب کے گھر کام کرنے چل پڑتی ہے وہ سوائے صبر کے اور کر بھی کیا سکتی تھی، شیخ صاحب اپنے کاروبار کے سلسلے اکثر بیرونِ شہر ہوتے ہیں ان کی عدم موجودگی میں ان کی اولاد بگڑ چکی تھی، وہ شیخ صاحب کے گھر ۱۰ سال سے کام کر رہی تھی، شیخ صاحب کی بیٹیاں کالج سے واپسی پہ بتاتی ہے کہ کل شام پانچ بجے ہماری کلاس کی پارٹی ہے ڈرائیور کو تیار رہنے کا حکم صادر فرمانے کے بعد اپنے اپنے کمرے میں چلی جاتی ہیں۔

اگلے دن صبح وہ پھر مزدوری کرنے جاتی ہے اور سارا دن مزدوری کرنے کے بعد جب شام کو وہ پیسے لینے جاتی ہے تو ٹھیکیدار کہتا ہے کہ بی بی! تم ابھی انتظار کرو۔

وہ کافی دیر انتظار کرتی ہے، جب سب مزدور پیسے لے کے چلے جاتے ہیں تو ٹھیکیدار سلمان اسے آواز دیتا ہے اور کہتا ہے کہ:

''بی بی! پیسے ختم ہو گئے ہیں تم کل اکٹھے پیسے لے لینا۔''

وہ شدید پریشانی کی حالت میں اسے جواب دیتی ہے کہ میں تو پیسے لے کر ہی جاؤں گی کیونکہ اکرم کے ابا کی دوائی بھی لینی ہے، گھر کا راشن بھی لینا ہے اگر پیسے نہ ملے تو

صاحب،ہم کھائیں گے کہاں سے۔۔۔؟

ٹھیکیدار سلمان جو انتہائی گھٹیا سیرت کا مالک تھا وہ اپنی کرسی سے اٹھتا ہے اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کمرے کے دروازے پہ لٹکتا ہوا پردہ ٹھیک کرتا ہے پھر اس کے پاس آکر کہتا ہے تمہیں، تمہارے پیسے بھی مل جائے گے بلکہ ایڈوانس بھی مل جائے مگر۔۔۔

مگر کیا ٹھیکیدار صاحب! (وہ معصومانہ لہجے میں انسانی روپ میں چھپے بھیڑیے سے سوال کرتی ہے۔)

وہ اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہتا ہے کہ تم کتنی خوبصورت ہو صرف ایک بار۔۔۔ ٹھیکیدار کی اس حرکت سے وہ آگ بگولا ہو جاتی ہے اور کہتی ہے کہ ہم غریب ضرور ہیں مگر بے غیرت نہیں، ہم بھوکے تو مر سکتے ہیں لیکن حرام نہیں کھا سکتے یہ بات کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکلتی ہے تو لوگ اس کی بے حسی کا مذاق اڑاتے ہیں وہ سب سے بے پرواہ ہو کر شیخ صاحب کے گھر کا رخ کرتی ہے شام کے پانچ بج چکے ہوتے ہیں شیخ صاحب کی بیٹیاں پارٹی کے لیے تیار ہو کر گاڑی میں جا رہی ہوتی ہے، سڑک کی تعمیر کی وجہ سے ڈرائیور گاڑی آہستہ چلا رہا تھا لیکن شیخ صاحب کی بیٹیاں اسے تیز گاڑی چلانے اور میوزک تیز کرنے پر مجبور کرتی کہ وہ پہلے ہی پارٹی سے لیٹ ہو رہی ہے ہے ادھر اکرم کی ماں آنکھوں سے آنسو بہائے اپنی قسمت پہ رو رہی تھی ادھر ڈرائیور تنگ آکر رفتار بڑھاتا ہے تو نکڑ پر گاڑی کی ٹکر سے اکرم کی ماں شدید زخمی ہو جاتی ہے۔۔۔

ڈرائیور جلدی سے باہر نکل کر دیکھ کر کہتا ہے کہ بی بی! یہ تو اپنے گھر میں کام کرنے والی ہے، اس کی حالت تشویشناک ہے اس کو جلدی سے ہسپتال لے کر جاتے ہیں، اکرم کی ماں خون میں لت پت پڑی تھی اس کی سانس اکھڑی ہوئی تھی چھوٹی بی بی اس کو دیکھ کر زور سے چلاتی ہے ''او مائی گاڈ'' اس کے کپڑے بہت گندے ہیں اگر ہم اس کو اپنی گاڑی میں بٹھائیں گے تو ہماری گاڑی گندی ہو جائے گی اور ہمیں تو پارٹی سے پہلے ہی دیر ہو رہی ہے۔

کوئی جا کرا کرم کے گھر اس حادثے کی اطلاع دیتا ہے اس کو کیا خبر تھی کی گھر میں صرف ایک معذور آدمی ہی ہے۔اکرم کا باپ یہ خبر سنتے ہی چار پائی سے اٹھنے کی کوشش کرتا ہے اور سیڑھیوں سے گر کر زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے جان کھو بیٹھتا ہے۔

اکرم کو بھی اطلاع ہو چکی تھی وہ اپنے دوست کے ساتھ بھا گا بھا گا آتا ہے لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔اکرم وہی بیٹھا اپنی کل کائنات اجڑ جانے پر نوحہ کناں ہوتا ہے کہ کسی بڑی شخصیت کا قافلہ وہاں سے گزرنا ہوتا ہے،سکیورٹی والے اس کی ماں کو تڑپتا اٹھا کر کسی کوڑے کی طرح سڑک کے ایک کنارے رکھ دیتے ہیں تا کہ ''بڑی شخصیت'' کا قافلہ گزر سکے اور اتنی ہی دیر میں اس کی ماں اس جہاں سے گزر جاتی ہے۔

لوگوں نے باتیں سنی ہیں لیکن ہم نے حقیقت میں دیکھ لیا کہ واقعی اس ملک کی تعمیر وترقی میں غریبوں کا پسینہ ہی نہیں بلکہ خون بھی شامل ہے اور اس مٹی پر ان غریبوں کا استحصال ٹھیکیدار سلمان اور شیخ صاحب کی بگڑی اولاد کی طرح اس ملک کے بگڑے حکمرانوں کے ہاتھوں جاری ہے آج بھی اکرم کی ماں کی طرح کتنے غریبوں کے لہو کا قرض اس مٹی پر باقی ہے۔۔۔

دھوکہ

ارم اپنے خوابوں میں رہنے والی نازک سی لڑکی تھی۔ نازک ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین بھی۔ پر کبھی کبھی انسان کا ذہین ہونا اس کا ساتھ نہیں دیتا۔ ایسا ہی ارم کے ساتھ ہوا۔ ارم میٹرک میں تھی اس کے پیپر ہو رہے تھے جس دن ارم کا انگلش کا پیپر تھا ارم کی طبیعت یک دم خراب ہوگئی جس کی وجہ سے وہی پیپر نہیں دے سکی اور اس بات کو لے کر بہت روئی۔ ارم کے والدین نے اُسے سمجھایا کہ اس کا پیپر سپلیمنٹری پیپرز میں دے دینا تب ارم کی جان میں جان آئی۔ ارم کے والد ایک فیکٹری میں آفیسر تھے۔ ارم پیپر کی تیاری کرتی رہی پھر ارم کے والد نے اس کا داخلہ بھیجنے کے لیے ارم کے فارم اپنے فیکٹری میں کام کرنے والے احمد کو دیے کہ ان فارم کو جمع کروا دے تا کہ ارم پیپر دے سکے۔ احمد نے وہ فارم لے لیے۔ احمد نے گھر آ کر فارم پڑھے وہاں اس کی تاریخ پیدائش نہیں لکھی تھی۔ کل فارم جمع کروانے کی آخری تاریخ تھی۔ احمد نے فارم پر لکھے ہوئے نمبر پر فون کیا تو ارم نے اٹھایا اور بولی کون؟ احمد سمجھ گیا کہ یہ اتنی خوبصورت آواز ارم کی ہو سکتی ہے۔ احمد نے بتایا کہ میں آپ کے والد کی فیکٹری میں کام کرتا ہوں اور آپ کے فارم میں نے جمع کروانے ہے۔ آپ اپنی تاریخ پیدائش لکھنا

بھول گئی ہے۔ارم نے احمد کو اپنی پیدائش کی تاریخ بتائی اور فون بند کر دیا۔اگلے دن احمد نے ارم کے ابو کو بتایا کہ میں نے فارم جمع کروا دیے ہیں۔احمد پر ارم کے ابو بہت اعتماد کرتے تھے۔احمد کی عمر ۲۸ سال تھی۔غیر شادی شدہ تھا جبکہ ارم ۱۹ سال کی۔اس سے اگلے دن ارم نے شکریہ ادا کرنے کے لیے احمد کو فون کیا۔احمد نے اُس کے ساتھ بڑے آرام سے بات کی آہستہ آہستہ فون کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ارم نے میٹرک پاس کر کے کالج میں داخلہ لے لیا۔ارم کے کالج کے فارم بھی احمد نے جمع کروائے۔اب احمد اور ارم دن رات فون پر بات کرتے۔اس بات کا علم کسی کو نہیں تھا سوائے ارم کی بہن ماریہ کو۔ماریہ نویں جماعت میں تھی۔ایک دن ارم نے احمد کو کہا آج گھر میں امی اور ابو نہیں ہے، دونوں گاؤں گئے ہیں۔تم گھر آ جاؤ میں اور ماریہ ہے۔بس پہلے تو احمد نے انکار کر دیا پھر ارم کے بار بار کہنے پر حامی بھر لی اور ٹھیک ۲۰ منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ارم سمجھ گئی کہ احمد آیا ہے۔ارم نے خود کو پہلے سے تیار کر لیا تھا۔ارم نے گیٹ کھولا اور ایک دم دیکھ کر حیران رہ گئی کہ جس کے ساتھ وہ رات دن بات کرتی ہے وہ اس سے اتنا بڑا ہے اور لڑکا بھی نہیں اس میں آدمی جیسی Look آتی ہے۔پر خیر ارم نے خود کو سنبھالا اور احمد کو اندر بلا لیا اور اسے کھانے کے لیے پوچھا۔احمد سمجھ گیا کہ ارم مجھے دیکھ کر خوش نہیں۔اس نے ارم کا دل جیتنے کے لیے پیار بھری باتیں شروع کر دی اور ارم کا دل پھر سے موم ہو گیا۔اب ملنے ملانے کا یہ سلسلہ شروع ہو گیا جب بھی ارم کے ابو امی گاؤں جاتے احمد ارم سے ملنے آتا اور ارم احمد کے لیے طرح طرح کے کھانے بناتی۔

ارم اور احمد کی ذات علیحدہ تھی۔ارم اس بارے میں سوچ کے پریشان ہوتی مگر احمد اُسے تسلی دیتا کہ وہ بس اس کا ہے اور ارم میری۔ایک دن احمد نے ارم کو کہا کہ اس کے والدین اس کی شادی بہت جلد کرنا چاہتے ہیں۔ارم بہت روئی، احمد نے اسے تسلی دی اور کہا تم اپنی تصویر مجھے دو میں اپنے گھر والوں کو راضی کروں گا۔ارم عقل کی اندھی بنا سوچے سمجھے

اپنی تصویر احمد کو دے دی۔ ایک ہفتے بعد جب ارم نے تصویر کے بارے پوچھا تو احمد نے بتایا کہ اس کے گھر والوں کو تم بہت پسند ہو مگر ذات الگ ہونے کی وجہ سے وہ نہیں مان رہے۔ ارم اب رات دن روتی رہتی احمد اُسے یقین دلاتا کہ وہ بس اس کا ہے۔ پھر دو دن بعد ارم نے احمد کو فون کیا تو احمد نے کہا کہ وہ آج بات نہیں کر سکا گھر میں مہمان آئے ہیں اس طرح ارم اور احمد کی بات ہوئے بغیر تین دن گزر گئے۔ ارم نے تیسرے دن احمد کو فون کیا تو احمد نے کہا مجھے ملنا ہے تم سے۔ ایسا کرو کل تم کالج جانا اور کالج کے باہر میں کھڑا ہوں گا۔ میرے ساتھ آنا ہم کسی ہوٹل میں بات کریں گے بیٹھ کر۔ ارم تو احمد کے پیار میں پاگل اُس نے ایسا ہی کیا۔ بنا کسی کو بتائے احمد کے ساتھ ہوٹل آ گئی وہاں احمد نے بتایا کہ اس کی منگنی اس کی آپی کی نند کے ساتھ ہوگئی ہے۔ ارم تو ایک دم سکتے میں آ گئی پھر کیا احمد نے ایک اور بات سنادی کہ میں خوش نہیں ہوں میرے دل میں بس تم ہو مگر میں مجبور ہوں کیونکہ اگر میں نے آپی کی نند فرح سے شادی نہ کی تو وہ میری بہن کو گھر سے نکال دیں گے۔ ارم چپ چاپ احمد کی باتیں سنتی رہی اور دل ہی روئی۔ مگر بات کرنے کا سلسلہ ارم اور احمد کے درمیان جاری رہا اور آخر کار وہ دن بھی آ گیا جب احمد کی شادی ہوگئی۔ ادھر ارم کا رو رو کے برا حال، آخر کس کو اپنا دکھ بتائے۔ شادی کے بعد بھی احمد بات کرتا رہا ارم کے ساتھ، پر پہلے کی طرح نہیں دو دو دن گزر جاتے۔ ارم کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ احمد اس سے بات کرتا ہے اور اپنی بیوی فرح کو نا پسند۔ احمد کی شادی کو ایک سال ہو گیا۔ ایک دن ارم نے احمد کو ملنے کے لیے کہا۔ احمد نے کہا میں ہسپتال ہوں بعد میں بات کرتا ہوں۔ ارم کے دل میں عجیب سے خیال آئے۔ وہ احمد کے لیے دعائیں مانگتی رہی۔ اگلے دن ارم نے دوبارہ احمد کو فون کیا مگر اس نے بات نہ کی۔ شام اسی دن ارم کے ابو فیکٹری سے آئے گھر اپنے ساتھ مٹھائی لے کر آئے۔ ارم نے کہا ابو مجھے مٹھائی بہت پسند ہے اور جلد ڈبہ کھول کر مٹھائی کھانا شروع ہوگئی۔ جب ارم کی امی نے پوچھا کہ یہ مٹھائی کیوں لے کر آئے ہیں تب ارم کے ابو نے بتایا کہ اس کی فیکٹری

میں جو احمد کام کرتا ہے اس کے ہاں کل بیٹا ہوا ہے یہ سن کر ارم بے ہوش ہو گئی۔

پھر جب آنکھ کھولی ارم ہسپتال میں تھی۔ارم اپنی امی کے گلے لگ کے بہت روئی۔ ارم کی امی نے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ارم نے بہانہ بنایا کہ اسے چکر آ گیا تھا۔ارم گھر آ گئی اس نے خود کو بہت مشکل سے سنبھالا۔اب ارم اور احمد کو بات کیے ہوئے دو مہینے گزر گئے تھے۔ارم اب اپنی زندگی دوبارہ نئے سرے سے گزارنا چاہتی تھی۔ایک دن فون کی گھنٹی بجی ارم نے فون اٹھایا پھر وہی پوچھا کون؟ آگے سے جواب آیا تمہاراا احمد۔ارم نے ایک بار پھر خود پر قابو رکھا اور کہا کیوں فون کیا ہے۔احمد کی پھر وہی باتیں، میں نہیں رہ سکتا تمہارے بغیر۔۔۔احمد کی باتوں میں ارم ایک بار پھر آ گئی۔ایک بار پھر فون کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ارم بہت سارے تحفے احمد کو دیتی اور جب احمد کو پیسوں کی ضرورت پڑتی وہ بلا جھجک ارم سے مانگ لیتا۔انہیں دنوں ارم کی کالج میں ایک نئی دوست زینب بن گئی۔زینب اور ارم دونوں دوستیں بن گئی۔ارم نے اپنی ساری کہانی زینب کو بتائی۔ایک بار قسمت پھر بدل گئی۔جب زینب نے ارم کی کہانی سنی تو بولی احمد جس کی تم بات کر رہی ہو اس کی شادی میری بہن کے ساتھ ہوئی ہے۔ارم کو یقین نہ آیا پر جب اگلے دن زینب احمد اور فرح کی شادی کی تصویریں لے کر آئی تب ارم حیران رہ گئی۔

زینب بہت اچھی تھی اس نے ارم کو بتایا کہ فرح اور احمد بچپن سے ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور یہ بھی کہ احمد نے تو تمہارا نام تک گھر میں نہیں لیا۔یہ ساری باتیں سن کر ارم کا خود پر قابو نہ رہا اور وہ زینب کے گلے لگ کے خوب روئی۔رات کو جب احمد کا فون آیا تو ارم نے اسے بتایا اور اُسے کہا تم ایک جھوٹے انسان ہو۔احمد نے جب ساری باتیں سنی تو اس نے ارم سے کہا تم جیسی لڑکی سے کون شادی کرتا ہے جو اپنے ماں باپ کو دھوکہ دے سکتی ہے، جھوٹ بول سکتی ہے اور یہ بھی کہ میں تم سے کوئی پیار نہیں کرتا۔سب تمہارے ساتھ وقت گزارنا تھا اور تم سے پیسے لے کر اپنی جیب بھرنی تھی۔ارم کو یقین نہ آئے یہ وہی احمد ہے جو

کہتا تھا میں تمہارے لیے جان بھی دے سکتا ہوں۔ احمد نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

پھر کیا ارم اپنے آپ میں بھی بہت شرمندہ تھی کہ اُس نے اپنے والدین کے ساتھ جھوٹ بولا۔ ارم نے سب اللہ پر چھوڑ دیا اور اپنے والدین اور پڑھائی میں مصروف ہوگئی۔

اب ارم نے بی اے کر لیا ہے اور ایک اچھی زندگی گزار رہی ہے۔ ارم اب سوچتی ہے کہ جو ہوتا ہے اچھے کے لیے ہوتا ہے اور یہ بھی کہ والدین کو کسی کے پیچھے لگ کر دھوکا نہ دو۔ احمد نے ارم کو جو دھوکہ دیا ارم اُسے بھول چکی ہے۔

۲۳/ اکتوبر ۲۰۱۴ء بروز بدھ کو قلم قرطاس ادبی مجلس کا خصوصی اجلاس شعبہ اُردو جی سی یونی ورسٹی فیصل آباد میں ہوا۔ جس میں طلبا و طالبات کی کثیر تعداد نے شرکت کی اور جی سی یونی ورسٹی فیصل آباد میں قلم قرطاس ادبی مجلس کے قیام کا خیر مقدم کیا اور منتظمین کی خدمات کو سراہا۔ اجلاس میں قلم قرطاس ادبی مجلس کے باضابطہ طور پر ذمہ داران کا چناؤ بھی کیا گیا۔ طلبا و طالبات کی کثیر تعداد اور انتظامیہ کی مشاورت سے قلم قرطاس ادبی مجلس کے درج ذیل ذمہ داران کو نامزد کیا گیا۔

صدر: ناصر علی وارثی، سینئر نائب صدر: لیاقت علی

نائب صدر: حافظ حیات، جنرل سیکرٹری: حافظ آصف شہزاد

نشر و اشاعت: حافظ شہباز اور فنانس سیکرٹری مہوش نواز کا انتخاب کیا گیا۔

عائشہ مشعل

اپنے حصے کی شمع

اسکول بیل بجتے ہی دبیر باقی بچوں کے رش میں سکول گیٹ کی طرف بھاگا یہ ایک ہونہال بچہ جو کہ ہر مضمون میں نمایاں نمبروں سے پاس ہوتا اور ہر ٹیچر سے یہی کہتا کہ:

''ہر انسان کا ایک ہیرو ہوتا ہے جس کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے انسان اپنی زندگی کے اس کٹھن سفر میں بھی کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے میرے ہیرو میرے والد ہیں اور اس دنیا میں وہی میرا سب کچھ ہیں۔''

آج موسم کچھ زیادہ ہی خوشگوار تھا گرمیوں کی اس پہلی بارش میں بچہ اپنے من میں اپنے ہیرو پر مان لیے ہوئے آگے بڑھتا گیا۔ دبیر اس بارش میں نہاتا ہوا فخریہ انداز میں اسکول گیٹ سے باہر نکلا وہ بارش کی بوندوں کو اپنے اوپر گرتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اک اک بوند کا لطف اُٹھا رہا تھا۔ بارش کے پانی میں اُچھلتا ہوا یہ سنجیدہ بچہ کچھ شریر سا دکھائی دے رہا تھا اور یہ شوخی اس کے چہرے کو خوبصورتی میں تبدیل کر رہی تھی۔

(گھر سے اسکول کا فاصلہ تھوڑی ہی دیر کا تھا۔۔۔ دبیر کی پیدائش کے وقت اس کی والدہ انتقال کر گئی تھیں۔ تب سے اس کی پرورش اس کے باپ ہی نے کی تھی۔)

بارش کی بوندوں کو اپنے اندر سموتا، گلیوں میں کھڑے پانی کو اپنے پاؤں سے اُچھالتا ہوا وہ تقریباً گھر کی آدھی مسافت طے کر چکا تھا۔ آج دبیر نے گھر کے لیے دوسرا راستہ اختیار کر رکھا تھا تا کہ بارش میں کچھ دیر اور رہ سکے۔۔۔

پھر اچانک دبیر کا گزر ایک ویران گلی سے ہوا۔ گلی میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر ایک نقاب پوش پر پڑی جو کہ ہاتھ میں چاقو لیے دوسرے آدمی سے نقدی چھین رہا تھا۔ دبیر اب تک اس نقاب پوش کی آواز پہچان چکا تھا مگر پھر بھی وہاں کھڑا غلط اور درست کیا ہے؟ اس کا فیصلہ کر رہا تھا اس کو اپنی سماعتوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔۔۔ بچہ ابھی اسی تذبذب میں تھا کہ نقاب پوش اس کی طرف بڑھنے لگا اب تک وہ پہچان چکا تھا کہ نقاب پوش کون ہے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آرہا تھا کہ جو آدمی ہاتھ میں چاقو لیے کھڑا ہے وہ کوئی اور نہیں بلکہ اس کا ''ہیرو'' اس کا باپ ہے۔

بچہ صدمے کی حالت میں اپنے باپ کو دیکھتا رہا وہ یہ سوچ رہا تھا کہ میرے مطابق تو میرا باپ ہی دنیا کے عظیم ترین انسانوں میں سے ایک ہے مگر یہ کیا۔۔۔؟ میرا باپ تو معاشرے کے ماتھے پر ایک دھبہ ہے۔ بچے کے آنسو تو بارش کی بوندوں میں گم ہو گئے تھے جو کسی کو دکھائی نہ دیے مگر خون کے آنسو روتے دبیر کے دل کو اس کا باپ دیکھ چکا تھا۔

نقاب پوش یعنی دبیر کے والد کی آنکھیں مارے وحشت کے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بچے نے باپ کی توجہ اپنی طرف دیکھ کر ایک ناراض بچے کی طرح بغیر منزل متعین کیے دوڑنا شروع کر دیا۔ بیٹے کی یہ حالت دیکھ کر باپ بھی دیوانہ وار اس کا پیچھا کرنے لگا۔ باپ اب چلا چلا کر کہنے لگا۔

دبیر۔۔۔ دبیر۔۔۔ دبیر۔۔۔ میری بات سنو! رک جاؤ بیٹا۔ میں مجبور تھا اس لیے مجھ سے یہ سب ہو گیا۔ دبیر۔۔۔ مگر دبیر تھا کہ بغیر کچھ سنے ایک ہی دھن میں بھاگتا جا رہا تھا۔ بھاگتے بھاگتے ایک فیکٹری میں پہنچ گیا باپ بھی پیچھے ہی تھا۔ اچانک دبیر تیزاب

سے بھرے ڈرم سے ٹکرا گیا۔ تیزاب کے قطرے اچھل کر دبیر کے چہرے پر جا گرے۔ اسی حالت میں اُس پر بے ہوشی چھا گئی۔۔۔

ہوش آنے پر اُس کی دنیا بدل چکی تھی جب اس کی آنکھ کھلی تو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیا۔ اردگرد کی آوازیں مل کر اور پہلے سے زیادہ اثر لیے دبیر کے کانوں کے پردوں کو جیسے پھاڑ رہی تھی۔ بچہ ابھی بھی سمجھ نہ پایا کہ اس کے ساتھ کیا مسئلہ پیش آیا ہے۔ آپریشن کے بعد دبیر کمرے میں اکیلا تھا۔ پھر اچانک اس کو کچھ آوازیں اپنی طرف آتی ہوئی محسوس ہوئی جن میں سے ایک آواز سے اُس کی شناسائی تھی اور وہ آواز اس کے والد کی تھی۔ وہ بری طرح سے رو رہا تھا۔۔۔!

دبیر بیٹا۔۔۔! مجھے معاف کر دینا تمہاری اس حالت کا ذمہ دار میں ہوں کاش۔۔۔! میں نے برائی کا راستہ اختیار نہ کیا ہوتا تو آج میرے بیٹے پر مشکل وقت نہ آتا۔۔۔

بیٹا۔۔۔! مجھے بس ایک بار معاف کر دو میں برائی کا راستہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں گا اور محنت کی کمائی کروں گا۔

دبیر پہلے ہی اپنی حالت سے پریشان تھا اپنے والد کے یہ کلمات سن کر اس کے سینے سے لگ کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

دبیر: ابو آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ یہ کام دوبارہ نہیں کریں گے۔۔۔؟

باپ: ہاں بیٹا۔۔۔! میں وعدہ کرتا ہوں میں اب کوئی غلط کام نہیں کروں گا۔ تم بس جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ پھر ہم اپنی زندگی نئے سرے سے شروع کریں گے۔ بس اب گھر چلو۔۔۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اب تم گھر جا سکتے ہو۔

ہسپتال سے ڈسچارج ہوتے ہی دونوں باپ بیٹا اپنے گھر واپس جا رہے تھے کہ اچانک راستے میں کچھ نامعلوم افراد نے ان پر حملہ کر دیا۔ ان میں سے ایک آدمی نے دبیر کو اس کے باپ سے دور پھینک دیا۔ یہ لوگ دبیر کے باپ کے باس کے آدمی تھے جنہوں نے

اسے کام چھوڑنے پر قتل کر دیا۔۔۔تا کہ اُن کے راز پولیس تک نہ پہنچیں۔ دبیر اپنے باپ کو بری طرح چیختے ہوئے سن سکتا تھا مگر وہ زخم کچے ہونے کی وجہ سے کسی قسم کی مزاحمت نہ کر سکا۔ پس وہ کسی وحشت زدہ ہرن کی طرح اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا اور پتھر سے ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔۔۔!

اس ٹھوکر نے دبیر کو ماضی کی یادوں سے نکالا شاید یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی ٹھوکر تھی۔ جس کے باعث دبیر کی زندگی بدل گئی۔ وہ اپنے ماضی کی اس یاد میں بعض اوقات اسی طرح سے بری طرح الجھ جایا کرتا تھا اور جب وہ حال میں واپس آتا تو خود کو پسینے سے شرابور پاتا۔ آج 20 سال کے بعد جب وہ اُس پتھر کی ٹھوکر سے کٹھن یادوں سے باہر آیا تو اپنے آپ کو پارک کے ایک کونے میں پڑے لکڑی اور لوہے سے بنے بینچ پر پایا۔ اس کی سانس پھول گئی تھی اور دل کی دھڑکن تیز تھی۔

اب شام کے پانچ بج چکے تھے یہ بدھ کا دن تھا دبیر پارک میں موجود ہر حرکت کو محسوس کر سکتا تھا۔ وہ پھولوں کی خوشبو سے محظوظ ہوتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ پانی کی آواز اُسے بارش کی یاد دلاتی تھی۔ بچوں کا اپنے والدین سے کھلونوں کی فرمائش کرنا بھی اُسے بچپن کی یادوں میں لے جاتا تھا۔ انہی آوازوں کو محسوس کرتے ہوئے اپنی چھڑی سے راستے ناپتے پارک سے باہر آیا پھر فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔۔۔! اچانک اس کی سماعتوں کا ٹکراؤ کچھ ایسے شور سے ہوا جو کسی بھی حالت میں اچھا نہ تھا۔ پاس ایک بچی کے رونے کی آواز آئی ان حرکات نے اس کے ضمیر کو جھنجھوڑ دیا۔۔۔ ماضی میں کسی ایسے ہی لمحے وہ اس بچی کی طرح رو رہا تھا اور اپنے باپ کے لیے کچھ نہ کر پایا تھا۔

دبیر اب اپنی خداداد صلاحیت سے اپنے حواس کی مدد سے غلط درست کی تمیز آسانی سے کر لیتا تھا۔

اس نے سوچا وہ آج معاشرے کے ایسے لوگوں کا ضرور سامنا کرے۔۔۔ دل

میں یہ عزم لیے آگے بڑھا، واردات کرنے والے آدمی پر اپنی چھڑی سے حملہ کر دیا۔۔۔ان دونوں کے درمیان تھوڑی دیر ہاتھا پائی ہوئی پھر اچانک دبیر لڑکھڑا کر سڑک پر جا گرا۔۔۔ ایک ٹرک اس کی ٹانگوں کو کچلتا ہوا نکل گیا۔اب تک بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔حملہ آور اس بھیڑ کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے بھاگ نکلا دبیر کی دونوں ٹانگوں کی ہڈیاں پس کر چور چور ہو چکی تھی۔لوگوں نے اسے قریبی ہسپتال میں پہنچا دیا۔تین گھنٹے ایمرجنسی میں رہنے کے بعد ہوش آیا۔دبیر کو پتہ چلا کہ اب یہ اپنی دونوں ٹانگوں سے محروم ہو چکا تھا۔ڈاکٹر اور نرس دبیر کو اس کی حالت بتانے میں جھجھک رہے تھے کہ آیا اسے کوئی صدمہ نہ پہنچے مگر وہ سمجھ چکا تھا کہ اس کی ٹانگیں بھی اب سلامت نہیں رہیں۔۔۔!

دبیر خوش تھا کہ اس نے ظلمتِ شب کو شکوہ کرنے کے بجائے اپنے حصے کی شمع جلانے کی ایک حقیر سی کوشش تو کی ہے۔

مجرم کون؟

عالیہ کے مرتے ہی گھر میں کہرام بپا ہو گیا۔ وہ خون میں لت پت چار پائی پر پڑی تھی۔ زمین بھی خون سے رنگین ہو گئی تھی اور عورتیں جوان لڑکی کی لاش کو دیکھ کر دھاڑیں مار مار رو رہی تھیں اور بچے اور مرد افسردہ کھڑے تھے۔ یہ میت اس بیچاری اور بے بس لڑکی کی تھی جس کے گھر والوں نے بچپن میں ہی اس کے ماموں کے بیٹے حماد کے ساتھ اس کا رشتہ جوڑ دیا تھا۔ اس کے کفن دفن کے بعد لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ ''بے چاری کو محبت کی سزا ملی ہے۔ کوئی کہتا تھا بھائیوں نے ظلم کیا ہے۔ کسی کی زبان پہ تھا کہ آخر اس نے محبت کر کے کونسا گناہ کر لیا ہے!''

بچپن میں ہی عالیہ کی منگنی اس کے ماموں کے بیٹے حماد سے کر دی گئی تھی۔ جب عالیہ کو اس بات کا علم ہوا تو وہ حماد سے محبت کرنے لگی اور حماد بھی عالیہ کو بے پناہ چاہتا تھا۔ وہ دونوں ایک ہی شہر میں رہتے تھے اور ان کے گھروں میں تھوڑا ہی فاصلہ تھا۔ وہ کسی نہ کسی کام کے بہانے دن میں ایک دو بار ضرور مل لیتے تھے۔ ان کے پیار کے دن ہنسی خوشی گزر رہے تھے کہ ایک دن حماد کے ابو کو ہارٹ اٹیک ہو گیا اور وہ انتقال فرما گئے۔ اس کے بعد گھر کی

ساری ذمہ داریاں حماد پہ آن پڑیں دونوں چھوٹی بہنوں اور بھائی کی تعلیم کے اخراجات بھی حماد کو برداشت کرنا پڑے اسے ابھی کوئی ملازمت بھی نہیں ملی تھی اسی وجہ سے اپنے باپ کا پیشہ سنبھالا اور کاشتکاری کرنے لگا۔

ادھر عالیہ کے گھر والے اس کی شادی کے بارے میں فکرمند تھے اور حماد کے گھریلو حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے وہ عالیہ کی شادی حماد سے کرنے سے انکار کر رہے تھے۔ جب عالیہ کو اس بات کا پتہ چلا تو وہ مسلسل پریشان رہنے لگی اور اسی پریشانی کا راز معلوم کرنے کے لیے ایک شب اس کی ماں اسکے کمرے میں آئی اور اس سے اس کی پریشانی کے بارے میں پوچھا تو عالیہ نے روتے ہوئے اپنے دل کا حال ماں سے کہہ دیا۔

عالیہ: ''میں حماد سے پیار کرتی ہوں اور اسی سے شادی کرنا چاہتی ہوں وہ میرا منگیتر ہے اور میں اسی کے ساتھ ہی خوش رہ سکتی ہوں۔''

اس کی ماں اس کو سمجھاتے ہوئے: ''بیٹی! تجھے تو پتہ ہے کہ وہ غریب لوگ ہیں، ہمارا اور ان کا معیار یکساں نہیں۔۔۔تُو اسے بھول جا۔۔۔''

لیکن عالیہ اپنے فیصلے پر ڈٹی رہی اور کسی بھی طرح حماد کا ساتھ چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئی۔

شام کے وقت سب لوگ کھانے کی میز پر جمع ہوئے تو ان میں عالیہ کا بڑا بھائی جمال کھانے پر انکے ساتھ شامل نہیں تھا تو نسرین پوچھنے لگی'' آج جمال صبح سے گھر نہیں آیا اور صبح مجھے بِنا بتائے چلا گیا تھا خدا خیر کرے۔'' عالیہ کی ماں اسے تسلی دیتے ہوئے:

''بہو! آپ پریشان نہ ہوں، وہ آجائے گا مجھے بتا کر گیا تھا وہ سلمان کے گھر گیا ہے الیکشن سر پر ہیں نا! اس سے کچھ مشورہ کرنے گیا ہے۔''

جمال رات گئے واپس آیا اور اپنے بیڈروم میں جا کر سو گیا صبح ناشتہ کی میز پر سب کو Good Morning کہہ کر مبارکباد دی کہ'' کل رات میں نے عالیہ کی شادی کی بات

سلمان کے ساتھ پکی کر دی۔''

نسرین بات کاٹتے ہوئے بولی: ''ہاں بھئی! میں تو خود بہت خوش ہوں کہ اتنے امیر گھرانے میں ہماری عالیہ کا رشتہ ہونے جا رہا ہے۔''

عالیہ یہ سب باتیں سن کر پریشان ہوگئی اور کھانا چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اس نے اپنی امی اور بھابھی کو شادی سے صاف انکار کر دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ ''اگر میری شادی حماد کے علاوہ کسی اور سے کریں گے تو میں اپنی جان دے دوں گی مگر کسی اور سے شادی نہیں کروں گی۔'' اب عالیہ ہر وقت پریشان رہتی اور سوچوں میں کھوئی رہتی۔ جب حماد کو اس بات کا پتا چلا کہ عالیہ کی شادی کسی اور سے ہو رہی ہے تو اس کی حالت اور بھی ابتر ہوگئی اور وہ اپنے ہوش کھو بیٹھا۔ صدف جو حماد کے پڑوس میں رہتی تھی اس نے عالیہ کو اس بات کی خبر دی تو وہ کسی کو بنا بتائے دیوانہ وار بھاگتی ہوئی حماد کے گھر پہنچتی ہے اور اس سے گلے لگ کر روتی ہے اور ساتھ جینے مرنے کے وعدے کرنے لگتی ہے۔

حماد اس کو سہارا دیتے ہوئے: ''میں تمھیں کسی اور کا ہونے نہیں دوں گا۔''

''حماد! میں تمہارے بنا مر جاؤں گی، میں کسی اور کی نہیں ہو سکتی، میں تمہاری ہوں، صرف تمہاری۔۔۔''

گھر میں عالیہ کی غیر موجودگی کی وجہ سے ایک تہلکہ مچا ہوا تھا۔ جمال اور ندیم دونوں بھائی بھاگتے ہوئے حماد کے گھر عالیہ کا پتا لینے گئے تو وہ انھیں وہاں مل گئی اس کے بھائیوں نے اسے واپس گھر لانے کی کوشش کی تو وہ حماد کی امی سے دیوانہ وار لپٹ گئی اور واپس جانے سے انکار کر دیا اور کہتی ہے ''نہیں۔۔۔ میں سلمان سے شادی نہیں کروں گی۔'' نہیں پر زور دیتی رہی، مگر اس کے بھائی اسے اس بات پر رضا مند کر کے واپس لے جاتے ہیں کہ وہ اس کی شادی حماد سے ہی کریں گے اور اس کی مرضی کے خلاف نہیں جائیں گے لیکن اگلے ہی دن جب حماد کھیتوں میں جانے لگا تو جمال اور ندیم اس سے پہلے ہی کھیتوں کی

طرف جانے والے راستے میں چھپ کر بیٹھ گئے اور جب وہ نہر کے کنارے گھنے درختوں کے جھنڈ میں سے گزرنے لگا تو انھوں نے اسے پکڑ لیا اور بہت مارا یہاں تک کہ اسے لہو لہان کر دیا اور بار بار اس سے یہی منوانے کی کوشش کرتے رہے کہ وہ خود عالیہ سے شادی کرنے سے انکار کر دے تاکہ یہ بات سنتے ہی عالیہ کے دل میں بھی حماد کے لیے نفرت آ جائے اور وہ حماد کا نام لینا بھی گوارہ نہ کرے لیکن جب وہ یہ سب کرنے میں ناکام رہے تو اسے ادھ موا کر کے وہیں چھوڑ کر واپس چلے آئے ان سب حالات سے گزرنے کے باوجود حماد نے اس بات کا کسی سے ذکر نہ کیا کہ کہیں ان کی یہ بات سن کر حماد کے گھر والے اسے عالیہ سے شادی کرنے سے منع نہ کر دیں۔

گھر پہنچتے ہی دونوں بھائی عالیہ کے ساتھ جھگڑا کرنے لگے اور اس کو مارنے پیٹنے لگ جاتے ہیں کہ وہ حماد کے گھر کیوں گئی تھی؟ جمال غصے سے عالیہ کو مارتے ہوئے کہتا ہے۔ ''تو ہماری مرضی کے خلاف جائے گی، سلمان سے شادی نہیں کرے گی۔۔۔ یہ خیال تجھے آ ہی کیسے گیا؟ ہم اگلے جنم میں بھی تجھے حماد کا ہونے نہیں دیں گے۔'' اسی اثناء میں جمال عالیہ پر گولی چلا دیتا ہے عالیہ ساتھ پڑی ہوئی چارپائی پر گر جاتی ہے اسی دوران عالیہ کی ماں بازار سے واپس آتی ہے تو عالیہ کو دیکھتے ہی اس سے لپٹ جاتی ہے اور بے اختیار رونے لگتی ہے۔۔۔ ''میری بیٹی کو کیا ہو گیا۔۔۔ اس کی یہ حالت کس نے کر دی۔۔۔ ارے! کس نے یہ ظلم ڈھایا ہے۔۔۔'' نسرین اپنی ساس کو سنبھالنے کی کوشش کرتی ہے کہ اتنے میں رونے کا شور سن کر پڑوس کے بچے، مرد اور عورتیں ان کے گھر دوڑے چلے آتے ہیں اس ہنگامے کے دوران ندیم گھر سے نکل جاتا ہے اور تھانیدار سے جا کر ملتا ہے اسے رشوت دیکر کہتا ہے کہ ''ہمارے گھر پہ ایک حادثہ ہو گیا ہے. جمال بندوق صاف کر رہا تھا کہ اچانک گولی چل گئی اور عالیہ کو لگ گئی اور وہ مر گئی۔''

تھانیدار پیسے لیتے ہوئے: ''آپ بے فکر ہو جائیں آپ کو کچھ نہیں ہوگا میں سب

سنبھال لوں گا۔''

تھانیدار نے رشوت لے کر عالیہ کے قتل کا کوئی ایکشن نہ لیا لیکن وہ یہ سوچتا رہا کہ ''انسان کی قیمت نوٹوں کے بدلے میں کتنی کم ہوگئی ہے، کیا محبت کر کے عالیہ نے جرم کیا تھا؟ اگر ایسا ہے تو جمال نے خود کیوں Love Marriage کی تھی؟''

تھانیدار کو رشوت تو مل گئی لیکن حق دار کو اس کا حق نہ مل سکا۔۔۔ چاہنے والے کو اس کا پیار نہ مل سکا۔۔۔ جمال نے بہن کو مار کر معاشرے میں اپنی عزت تو بچا لی لیکن حقیقت سے منہ نہ چھپا سکا۔۔۔ وہ محبت کا مجرم۔۔۔ معاشرے کا مجرم۔۔۔ پیار کا مجرم ہی نہیں بلکہ خدا کا بھی مجرم بن گیا۔۔۔

جی سی یونیورسٹی شعبہ اردو میں مقابلہ حسن نعت کا انعقاد

اہتمام قلم قرطاس ادبی مجلس نے کیا تھا، ڈاکٹر آصف اعوان نے انعامات تقسیم کیے

فیصل آباد (سٹی رپورٹر) قلم قرطاس ادبی مجلس، شعبہ اردو جی سی یونیورسٹی فیصل آباد کے تحت ''مقابلہ حسن نعت'' کا انعقاد کیا گیا۔ جس میں طلبا و طالبات کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ مقابلے میں اول انعام حافظہ صبیحہ، دوم طیبہ سرفراز جبکہ سوم انعام محمد بلال نے حاصل کیا۔ اس موقع پر جج کے فرائض ڈاکٹر سعید احمد اور ڈاکٹر طارق محمود ہاشمی نے انجام دیے۔ ڈاکٹر طارق محمود ہاشمی نے افتتاحیہ کلمات کے بعد قلم قرطاس ادبی مجلس کا تعارف، اغراض و مقاصد بیان کیے۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر آصف اعوان نے پوزیشن ہولڈرز میں انعامات تقسیم کیے۔ ڈاکٹر آصف اعوان نے قلم قرطاس ادبی مجلس کے زیر اہتمام سہ ماہی رسالے ''قلم قرطاس'' کی اشاعت پر شعبہ کے تمام اساتذہ اور قلم قرطاس ادبی مجلس کی انتظامیہ کی کاوشوں کو سراہا۔ اس موقع پر حافظ حیات، ناصر علی وارثی و دیگر بھی موجود تھے۔

اُستاد گوگی

وہ اُسے دیکھتے ہی چلایا! میاں صاحب کو گزر لینے دو۔۔۔

یہ ڈرائیور بھی کتنے عجیب ہوتے ہیں خود کو روڈ کا بادشاہ سمجھتے ہیں جبکہ ایک معمولی ٹریفک پولیس والے کی خوشامد کرنا تو ان سے پرے ہے۔ پھر ایسا کیوں، یہ بات ہمیں ایک دن فرنٹ سیٹ پر بیٹھنے سے معلوم ہوئی۔

گوگی ڈرائیور گاؤں کے نمبردار کی ویگن چلاتا ہے۔ وہ صبح سے ہی نمبردار صاحب کے گھر سے ویگن لے جاتا ہے اور سارا دن شہر میں مختلف سڑکوں پر لوگوں کو اُن کی منزل تک پہنچاتا ہے۔ نمبردار صاحب کو اس سے غرض نہیں کہ وہ ایک دن میں کتنا کماتا ہے۔ اس کے پٹرول کے علاوہ گھر کا خرچہ بھی پورا ہوتا ہے یا نہیں۔ صاحب نے روزانہ شام کو گوگی ڈرائیور سے بارہ سو روپے لینے ہیں۔ یہ بڑے غم کی داستان ہے گوگی ڈرائیور اپنی گاڑی کا تیل تو پورا کرنا ہی ہے اور اپنے گھر کا خرچہ بھی نکالنا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی مدد کے لیے گوگی ڈرائیور نے کالا خان کو گاڑی کا کنڈیکٹر بھی رکھا ہوا ہے۔ اُسے بھی شام کو کچھ خرچہ دینا ہے۔

آج اتوار کا دن ہے، مجھے کسی کام سے شہر صبح جلدی جانا پڑا۔ اس کے لیے میں

نے گوگی کی گاڑی کا انتخاب کیا۔ جو صبح صبح اپنی گاڑی لے کر جاتا ہے۔ گوگی نے مجھے دیکھتے ہی آواز دی ''اوئے کالے! بابو جی نوں اگلی سیٹ تے بٹھا۔'' صبح صبح گوگی نے گاڑی میں ٹیپ بھی لگائی ہوئی تھی۔ کوئی تین سے چار آدمی گاڑی میں موجود تھے۔ گوگی اور کالے نے گاڑی کو کافی سجایا بھی ہوا تھا، مگر یہ سب تو ظاہری نمائش تھی۔ وہ تیس منٹ تک گاڑی کو چوک میں لا کھڑی کرتا ہے تا کہ شہر جانے والے لوگ اس میں بیٹھتے جائیں۔ چونکہ آج اتوار کا دن ہے اس لیے سواریاں قدرے کم ہیں۔ یونہی وقت ہوتا ہے تو گوگی ٹی ٹی اور پاں پاں کرتا گاؤں سے نکلتا ہے۔ گاؤں کی چھوٹی سڑک پر چلتے گوگی کو ٹائروں میں ہوا کم محسوس ہوتی ہے تو وہ کالے سے دیکھنے کا کہتا ہے۔ کالا دھیمی آواز میں بولتا ہے ''اُستاد جی ٹیر پنچر آ آ۔۔۔'' گوگی نے گاڑی ایک طرف کر کے کھڑی کی اور خود اُتر کر جائزہ لینے کے بعد خاموشی سے گاڑی کا ٹائر کھولا اور کالے کے کندھے پر رکھ کر گاؤں کی طرف بھگا دیا۔ کالا کندھے پر وزن اُٹھائے دوڑ لگائے جا رہا ہے جبکہ گوگی ہاتھ صاف کرتا ہوا میری جانب لپکا۔ ''ہاہا۔۔۔ آ آ۔۔۔ ہاہو بابو جی بس تھوڑی دیر چہ آ جائے گا۔'' لوگ گاڑی سے اُتر کر کوئی دوسری سواری لینے کے لیے سڑک پر کھڑے ہو گئے اور گاگی باری باری ہر کسی کی خوشامد بھی کرتا اور اس کی گاڑی میں جانے کے لیے باتوں باتوں میں رضا مند کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ غریب کے دل کی دھڑکن ہے سواریاں پہلے ہی کم، اور جو ہیں وہ بھی جا رہی ہیں۔ گوگی بدستور اپنا رونا رو رہا تھا اور بے بسی ظاہر کیے جا رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ جتنی مرضی دیر ہو جائے مگر جاؤں گا گوگی کے ساتھ ہی۔ میں اس کی کچھ ہمت بڑھائی جس پر وہ اپنی بے بسی اور زیادہ ظاہر کرنا شروع ہو گیا۔

یہ ایک فطری عمل ہے کہ جہاں انسان کو کوئی اُمید جھلکتی ہے انسان بار بار وہاں خود کو پیش کرتا ہے۔ جس کا عملی نمونہ گوگی کی شکل میں میرے سامنے تھا۔ انہی باتوں میں کالا گاؤں سے پنکچر لگوا کر واپس آ گیا۔ یوں پسینے سے شرابور کالے نے اپنے اُستاد کی مدد کرتے ہوئے ٹائر کو دوبارہ اپنی جگہ لگایا اور شہر کی طرف رواں ہوئے۔

گوگی گاؤں کی چھوٹی سڑک سے جونہی شہر کی بڑی سڑک پر چڑھتا ہے تو پہلے سے محتاط ہو جاتا ہے۔ میں اس پر حیران تھا لیکن زیادہ ٹریفک اور بڑی سڑک کا سوچ کر دل کو تسلی دی مگر حقیقت کچھ اور تھی۔ گوگی ڈرائیور جیسے ہی شہر میں داخل ہوا تو ایک ٹریفک پولیس والے نے اُسے ہاتھ کے آشارے سے رکنے کو کہا۔ گوگی نے رکتے رکتے دھیمی سی آواز میں پولیس والے کو تین چار گالیاں دے دیں۔ جبکہ گاڑی کے پوری طرح سے رکنے سے پہلے ہی کالا ٹریفک پولیس والے سے بغل گیر تھا اور ساتھ ہی خوشامد کے بند بھی کھول دیے۔ پولیس والے نے گاڑی کے کاغذوں کا مطالبہ کیا جو کہ کالے کے آشارے پر اُستاد گوگی نے پیش کر دیے۔ کاغذ پورے۔۔۔ مگر پولیس والا جرمانہ کرنے کے لیے کوئی بہانہ سوچ رہا ہے۔ جبکہ گوگی اور کالا خوشامد لامتناہی سلسلہ شروع کیے ہوئے تھے۔ میں گاڑی میں بیٹھا دل میں سوچ رہا تھا کہ اب پتہ نہیں کون غلط ہے ایک طرف تو پولیس والا اپنے فرائض پورے کر رہا ہے لیکن دوسری طرف گوگی اور کالا غلطی نہ کرنے پر بھی جرمانے کے ڈر سے اپنی غریبی اور بے بسی دکھا رہے ہیں۔

پولیس والا جرمانہ کیوں کرے گا؟ کیا گوگی نے کوئی غلطی کی؟ پولیس والا رشوت کا خواہاں ہے؟ گوگی اور کالے کو غریب دیکھ کر جرمانہ کرنا چاہتا ہے؟ یہ وہ تمام سوال تھے جو ابھی میرے ذہن میں منڈلا رہے تھے اور میں ان سوالوں کو لے کر اپنی خودی میں غرق تھا کہ اتنے میں گاڑی کو چلاتے ہوئے گوگی اور کالے کے منہ سے پولیس والے کے حضور گالیوں کے لاتعداد تحفے پیش ہونے لگے۔ میں مسکرایا تو گوگی میری طرف راغب ہو کر بولا ''بابو جی اس ملک وچ غریب بندہ نہیں جی سکدا، ھن ویکھو نہ کوئی گل نہ بات وادھو دا چالان کٹ دیتا۔'' میں نے پوچھا کہ تمہیں کس بات پر جرمانہ کیا۔ تو گوگی نے نہ چاہتے ہوئے اپنے دل کی بھڑاس یوں نکالی۔ ''بابو جی جرمانہ کی کرنا میری سمجھ وچ نئی آیا کہ جرمانہ کیوں کیتا۔''

گوگی پریشان تھا سواریاں پہلے کم اور اوپر سے گاڑی خراب کے ساتھ ساتھ تین سو روپے کا صبح صبح ہی جرمانہ، گوگی نے بتایا کہ ان لوگوں کو اوپر سے ٹارگٹ دیا جاتا ہے جو

انہوں نے ایک دن یا ایک ماہ میں پورا کرنا ہوتا ہے۔اب ہم ایک بار جرمانہ ہونے پر دوبارہ وہ غلطی نہیں کرتے اور یہ لوگ اپنا ٹارگٹ پورا کرنے کے لیےطرح طرح بہانے ڈھونڈتے ہیں۔میں نے پوچھا کہ کس طرح کے بہانے؟ گوگی نے کہا کہ یہ ہم لوگ بھی نہیں سوچ سکتے۔ ایسے بہانے نکالتے ہیں ابھی پچھلے دنوں میرے ایک دوسرے ساتھ کا چالان اس بات پر کیا کہ اس نے بند جوتا نہیں پہنا ہوا تھا۔کبھی اس بات پہ چالان ہوتا ہے کہ گلے کے بٹن کیوں کھلے ہیں۔تو کبھی شلوار کی جگہ نیکر پہننے پر بھی جرمانہ ہوتا ہے۔تیز رفتاری،کاغذ نہ ہوں،اشارہ توڑنا وغیرہ تو سمجھ میں آتا ہے مگر اپنا ٹارگٹ پورا کرنے کے لیے چالان پر چالان کون کرتا ہے؟ بابو جی ان کو تو ٹیپ چلانے پر بھی اعتراض ہوتا ہے۔اب آپ ہی بتائیں کہ ہم کیا کریں۔ اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالیں یا ان کے ٹارگٹ پورے کریں۔

میں نے گوگی سے رات کو واپسی کا وقت لیا اور اپنے کام کو چل دیا۔وقت مقررہ پر میں گوگی کے ساتھ ایک بار پھر فرنٹ سیٹ پر تھا۔اب کے بار میں گوگی کو کریدنے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ روزانہ دو سے تین سو روپے بمشکل گھر لے جانے کو ملتے ہیں۔باقی چالان، گاڑی خراب،نمبر دار صاحب کے بارہ سو،پٹرول،کالے کا حصہ،پولیس والوں کا ایزی لوڈ اور کچھ جگہ ٹیکس وغیرہ میں نکل جاتے ہیں۔

بابو جی اگر ایک غریب کا بچہ پڑھ نہیں سکا تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ نالائق ہے۔بابو جی اسے اس کے گھریلو حالات نے نالائق کیا ہے۔میں نے گوگی کی اس بات پر اختلاف کیا تو گوگی پھوٹ پڑا۔بابو جی آپ کو گھر میں تین وقت کی روٹی ملتی ہے،اچھا کھانا اور مختلف انواع واقسام ملتی ہیں،اپنے بچوں کو اچھے سکول میں پڑھا سکتے ہیں،جب جو چاہیں کر سکتے ہیں۔پھر آپ نے تو یہ کہنا ہی ہے کہ غریب کا بچہ نالائق ہے۔اب ذرا میری بھی تو سن لیں۔دو سو روپے کی تو سبزی بھی نہیں آتی۔گھر کے اخراجات کے علاوہ کوئی بیمار ہو جاتا ہے،اور بجلی کا بل وغیرہ کہاں سے پورے کروں۔اگر کسی دن گاڑی پہ نہ جا سکا تو دو سو روپے بھی میسر نہیں۔پھر آپ کہتے ہیں کہ غریب کے بچے نالائق ہیں۔جو امیرِ شہر کو ماحول میسر ہے

وہ مجھے دیں، پھر دیکھیں کہ کس کے بیٹے کے نمبر زیادہ آتے ہیں۔میں دل ہی دل میں گوگی کی طرف داری کرنے پر مجبور ہوگیا اور گوگی دوبارہ یوں مخاطب ہوا: بابو جی اب آپ میرا سوچ رہے ہوں گے کہ میں کیوں نہ پڑھ سکا۔ بابو جی میری ساتھ بھی یہی مسائل تھے۔ ابا جی نے بچپن سے ہی محنت مزدوری پہ ڈال دیا۔تب گھر کا کچھ نظام چلا تھا۔

گوگی کی بات تو ختم ہوگئی تھی۔مگر وہ میرے دل کے تار چھیڑ گیا۔میں رات بھر یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ آخر گوگی جیسے لوگ اپنا گزارہ کیسے کرتے ہوں گے۔اگر گوگی کی بات کو فصاحت سمجھ کر دوسو کی بجائے پانچ سو بھی کر لیں تو کیا وہ گزر بسر کر سکے گا۔نہیں کبھی نہیں، کیونکہ ہم نے اُسے وہ نظام ہی نہیں دیا جس میں وہ امیر کے مقابلے میں آئے۔ یہ تو وہ نظام ہے جس میں غریب، غریب تر جبکہ امیر امیر تر ہو رہا ہے۔آج اتوار کا دن تھا جس وجہ سے دو سو روپے بھی نہ تھے۔گھر میں بوڑھا والد اور بیوی بچوں کے اخراجات گوگی کے سر ہیں۔گوگی اپنی آنکھوں میں اُمید لیے اپنے بچوں کو آگے لانا چاہتا ہے۔وہ اپنے حالات سے نالاں تو ہے مگر بے ہمت نہیں۔

چند دن بعد گوگی معمول کے مطابق گاڑی شہر لے کر جا رہا تھا مگر اسے کیا خبر شہر میں رات بھر سے کون سی سیاسی شورش ہوئی تھی۔شہر میں داخل ہوتے ہی چند ڈنڈا بردار اس کی جانب یہ کہتے ہوئے بڑھے کہ یہ کون بدمعاش گاڑی چلانے کی کوشش کر رہا ہے۔چشمِ زدن میں گاڑی کو آگ لگی، گوگی اور کالے کو اتنا مارا کہ بیچارے دونوں بے سروسامانی کی سی حالت میں شہر کی سڑک پر پڑے ہیں۔کسی نے مدد کی اور ہسپتال پہنچا دیا۔گاڑی جل کر راکھ ہو چکی تھی۔گوگی کی زبان پر ایک ہی لفظ ہے ''گڈی، میری گڈی۔۔۔میں نمبردار صاحب نوں کتھوں گڈی واپس کرنی۔'' اپنے زخموں سے چور ہو کر بھی نمبردار کی گاڑی ہی کہ فکر ہے۔

آج گوگی بستر المرگ پر ہے۔نمبردار نے گاڑی کے بدلے اُس کے گھر کی جگہ اور سامان اپنے قبضہ میں لے لیا ہے۔یقیناً یہ خبر گوگی تک پہنچنے سے پہلے گوگی مر گیا تھا۔

شاعری

خاور جیلانی	احمد مفاذ فازیؔ
حافظ محمد حیاتؔ	مبشر سعید

خاور جیلانی

مرگ زار

الختصر!
خشک وتر کے ہمکنارانہ تصرف کے گلے سے
ایک جنیو کی طرح لپٹی
لبوں سے کف اُڑاتی ۔۔۔ساحلی پٹی،
ریتلے ۔۔۔ویراں نوردی کے زیاں پرورد
قرب آبنائی کے ہوس خو
العطش کے نعرہ زَن
ایڑیوں کی بے ثمر رگڑائی سے غیضاں
ہوا کے تند، جارح، سَر پھرے جھونکوں کے ایمائی
بگولوں کی بنائے بادیہ پیما کے جوہرزاد
گردباد عسکر کے یودھا، جنگجو ذرات سے
صدیوں کی شورش آزمائی ۔۔۔ہمہ وقتی کی آویزش میں،
پسپائی ۔۔۔مسلسل غیر محسوسانہ پسپائی کے ہاتھوں
لبوں سے کف اُڑاتی ساحلی پٹی
سرکتی ۔۔۔ہوتے، ہوتے ۔۔۔دُور
صحرا (قرنہا پہلے کے صحرا) کے
مقام مرکزیت سے نہایت دُور جانکلی
۔۔۔نہایت دُور!

خشک وتر پہ
اپنی خوشتابی میں یکساں مہرباں
تیکھی روپہلی دُھوپ نے
ساحلی پٹی سے ملحق۔۔۔دُور تک پھیلے سمندر پر اُتر کر
سالہا۔۔۔ان تھک تپیدہ کارکاوش کی
کہ اس کی کارگہہ میں
بھاپ کا جاذب بخاراتی تسلسل
ابر یاتی آفرینش میں معاون ہو۔۔۔مگر ناکام
پانی بھاپ میں تحلیل ہو ہو کر اُڑا۔۔۔اُڑتا رہا
لیکن فضاؤں کی نمیدہ کوکھ میں خاکستری بادل کی افزائش نہ ہو پائی
رطوبت بانجھ نکلی!

یہ صحرا۔۔۔یہ سقفقوری سمندر!
بوندوں۔۔۔برشگال آثار بوندوں کے لیے ترسا ہوا ہے
یہ ایسا تشنہ لب، بے آب خطہ ہے
کہ جو بدو کے خود پر تھوک دینے کو بھی اِک نعمت سمجھتا ہے
یہ ریگستان۔۔۔یہ بدبخت ریگستان
جس کی ریگزاری میں
جمال آفتابی کی پرستش گیر۔۔۔ریگ بے کراں کی نقرئی موجیں
تجلیات تمثیلی کی ہیئت گر
بحیرۂ سرابانہ کی جل پریاں

توقعات کی بے محل خوش فہمی سے لے۔۔۔تا
۔۔۔مہمل اندیشوں کی بے جا سر گرانباری،
وقائع کو اُبھرتی ڈُوبتی لہروں کی صورت ڈھالنے کا تجربہ کرتے،
فریب دید کے پنھیار سیل بے یقیں پر
نیک و بد کی کشتیاں کھیتے۔۔۔
طلسماتی، سرابی منزلوں پر اپنے لنگر ڈالتے
آبی گماں آباد کرتے جاتے ملاحوں پہ۔۔۔کھیویوں پہ
ششدر ہیں!۔۔۔

ریگ بیکراں کی نقرئی موجیں
سخت متعجب ہیں اُن، زمردی بحری اُفق کے گھاٹ اُترتے
۔۔۔اور منظر برد ہوتے جارہے بجروں پہ
جن میں مانجھیوں کا رُوپ دھارے
اپنے بچے بِکتی نسلوں کے سوداگر۔۔۔
امیران بلادِ مرگ کے جلاد ہرکارے
۔۔۔وبائے زَر کے طاعونی!
عریض۔۔۔اسواق امصارِ جدیدہ میں
بنام صارفین حرمت خوں
کم سنوں۔۔۔یوسف مثالی کم سنوں کی کھیپ لا کر
الرفیق والعزیز والاخیہ کے تمسُّک،
ایک ہی معبد کے موبد۔۔۔ایک ہی ٹکسال کے مصنوع

درہم، پاؤنڈ، ین، دینار، ڈالر
حوالوں، ہنڈیوں میں منقلب کروا کے
دوبارہ رَسد لانے کو واپس جا رہے ہیں
آپ اپنا قافلہ اپنوں سے لٹوا کر لیے جاتے ہوئے قذاق!

سقنقوری فریبی ساحلوں پر
بے قرارانہ اُترتے کارواں کے کشتی بانوں۔۔۔
۔۔۔ہاتفوں، حمالوں، سقوں، ساربانوں، خاص برداروں کے کنچن
بازوؤں کی مچھلیوں کا مختتانہ
بے نیازانہ۔۔۔خراج ریگزاری کی اَدائی میں نچڑ کر قطرہ قطرہ گر رہا ہے
آنچ دیتی لُو میں صف آراء۔۔۔
ناہموار ٹیلوں کے تنوری دامنوں میں سرفروشانہ کھڑے
اہلاً وسہلاً مرحبا کا وِرد کرتے
ناخوش و بدحال و بیزار و پراگندہ کھجوروں کے گھنے جھنڈ اپنے
چھدرے سائے کی بالطف و باتسکین
وہی راحتوں کی رسیوں سے
تواتر کی سبک رفتاریوں سے تھک چکے اُونٹوں کے گھٹنے باندھ کر،
ان کو قطاروں میں بٹھائے
بھاری پشتاروں کی فرضیت کے بوجھل بار سے آزاد کرتے جا رہے ہیں

وہیں اکناف میں

صحرا کے سینے پر اقام عارضی کی آرزومندی
زمیں پر سرسراتی ریت کی لہروں پہ کھونٹے گاڑنے
خیمہ نشینی کی طنابیں کھینچنے۔۔۔قالیں بچھانے میں
دِل و جاں سے مگن ہے
یوں کہ جیسے یہ پڑاؤ
اس کی خاطر حاصل عمر رواں کی آخری منزل کا تحصیلی ذریعہ ہو!

حبابی زندگی ایسی۔۔۔سراسر عارضی آبادکاری کے مراحل سے گزر کر
عمر ایام ثلاثہ کے کنارے ایستادہ خیمہ بستی کی
زمینی ناف پر رکھے ہوئے دہاتی سقاوہ جات
آبی ٹینکروں سے بارہا سیراب ہو کر بارہا تشنہ لبی کا ذائقہ
محسوس کرنے کی کہانی کہہ رہے ہیں
اور شراب ناب پلوائے ہوئے اُشتار کا نتھنوں میں پیوستہ نکیلیں
ساربانوں کو تھما کر اپنے آقاؤں کی خدمت میں خصوصی
حاضری دینا۔۔۔وقوعہ بن رہا ہے

سَروں کے بار رومل پہ اسود گاتروں کی تہہ جمائے
پس شانہ لٹکتی ڈوریوں کے کسمساتے منتہی پھندنوں سے حرص لطف
مطبوعہ کیے
اپنے حبیبان قریبی کے جلو میں
زیب تن، ابیض چغے سنبھالتے شیوخ

شاہانہ رعونت کام میں لاتے ہوئے
بردہ فروشوں سے بہت پہلے خریدے جا چکے معصوم بچے۔۔۔
(جو اُن کے نزدشاید اس قدر نیکو نہیں ہیں
جن کی چیخیں دوڑتے اُونٹوں کی کوہانوں سے خانۂ خدا کے باب
رحمت تک پہنچ پائیں)
۔۔۔ملاحظہ کر رہے ہیں!

''اِسے زیبِ نظر ہونے کی زینت بخشئے یا شیخ!''
تعارف کا لحن خوشامدی مضمون کا جملہ بناتا ہے
''یہ قاسم ہے۔۔۔
مقدر جس کو بن قاسم کی صورت آپ کے دربارِ عالی میں
کجاوے پر جمل کی پیٹھ سے باندھا ہوا لاکر تعزز پا گیا ہے۔''
''تو اَب قاسم عجم سے اِس طرف آنے لگے ہیں''
عصبیت کے خواص کا تڑکا لگاتا تبصرہ کرتے جواباً
حاکمانہ برتری کی سخت گیر اُمید افزائی۔۔۔
سُخَن کے گوش برآواز پردوں کی سماعت پر درشت الفاظ کا چرکہ لگاتی ہے
''یہ بچہ۔۔۔
ابن قاسم ہو یا بن قاسم یا قاسم
اِسے ہر حال میں اس دوڑ کے میدان کو دیبل بنانا ہے''

یلہ، یلہ۔۔۔یلہ، یلہ۔۔۔

جبر کی تحقیر یہ گردان یک لفظی میں تسبیحات کے دانے
گزرتے وقت کی تندی بڑھانے کی سعادت پا رہے ہیں
اپنے رُوحانی تلذذ میں معرب گالیوں سے حظ اُٹھاتی
''معفی''،''معفی'' کی صدا کاری کی نوبت آزماتی
اِدھر آؤ، اُدھر جاؤ، اِسے کھولو، اُسے باندھو کا نقارہ بجاتی
بدوؤں کی فوج
اُشتارِ ستم کو تھپکیاں دینے سے فارغ ہو چکی ہے
ناقۂ نصرت پہ اپنا حق جتانے پر تلے اُونٹوں کی
کوہانوں سے باندھے جا چکے۔۔۔بلکہ سلائی ہو چکے
دہشت زدہ طفلان بدحالت کی چیخم چاخ
زنجیر درِ گوش اذیت کھٹکھٹا کر دوڑ کا آغاز کرتی ہے،

دوڑ کی خاطر مقرر راہ کے پہلو بہ پہلو
دُشتیابی ہانکتی جاتی ہوئی صحرائی جیپوں سے
نظارت کی فسوں کاری میں منجملہ
تماشائیوں کی آنکھیں دُوربینیں بن چکی ہیں
ریت مرغولوں میں اُڑ اُڑ کر
غبارانہ تکبر میں فلک سَر پر اُٹھانے کے لیے بے چینیاں دِکھلا رہی ہے
بھاگتے اُشتار۔۔۔جن کو پیٹھ پر رکھے کجاوں سے بندھے بچوں کی
ہاہاکار
توڑے دار بندقوں کے چھروں کی طرح سینے سے گزری جا رہی محسوس

ہوتی ہے
اور جن کی بکھیوں میں کینہ بڑھ کے جیت کی تاکید کے کاری ٹہوکے
دے رہا ہے
غضبنا کی میں پاگل ہو رہے ہیں!

کجاوہ جات کے جکڑن میں جکڑے
۔۔۔سار بانی کے لیے مجبور بچے
(ہلاکت جن کو ہلکوروں کے پنگھوڑے جھلاتی جا رہی ہے)
ہر اِک آتے ہوئے پل
ریڑھ کی ہڈی کے مہرے، صلب کی کڑیاں کھسکنے سے
لحم کے لوتھڑوں میں ڈھل چکے ہونے کی جانب بڑھ رہے ہیں
۔۔۔زندگی سے دُور ہوتے جا رہے ہیں
ممکنہ نشو ونما کے ان کے پنڈولم کو ساکت کر چکا اُن کا نصیبہ
(اُن کے زندہ بچ نکل جانے کے خدشے کی بنا پر)
اُن کے گرداگرد اپنی طرزِ نو کی ''دولہ شاہی''
''بونسائیت'' کا شکنجہ کس رہا ہے!

بیٹھتے جاتے غبارِ شور وشر سے اُٹھ رہے ''مبروک'' کا غمزہ
بھرے پنڈال کی سرشار بہجت کو صدا کی دَف بجانے کے لیے اُکسا
رہا ہے
''حبذا'' اور ''احسنت'' کا کلمۂ تحسین جاری کرتا جاتا وقت کا فرعون۔۔۔

(جس نے دوڑ کے میدان کو دیبل بنانے کا فریضہ ایک بن قاسم کو سونپا تھا)

پسینے سے شرابور اپنے فاتح اُونٹ سے آ کر لپٹ جانے اور اُس کی جھاگ کے چھینٹے اُڑاتی تھوتھنی کو چومنے کی مشق میں ہلکان ہوتا جا رہا ہے۔۔۔

اُونٹ کے خدام اپنے اُونٹ کی ٹانگیں دَبانے میں جتے ہیں

اور اس کی پشت سے باندھا ہوا۔۔۔جوں کا توں باندھا ہوا قاسم

مسلسل جانکنی میں۔۔۔زندگی کی ہار سے بالشت بھر کے فاصلے پر ہے

اِدھر ''مبروک'' کی دُھن ہر زُباں کے تار چھیڑے جا رہی مستی کے نغمے گا رہی ہے

اور ہزاروں کوس دُوری پر۔۔۔اُدھر

اِک گھر کی ویرانی کے آنگن میں

کسی غمناک ماں کی منتظر ممتا غم واندوہ کی سسکار بھرتی ہے

مرا قاسم۔۔۔مرا قاسم۔۔۔مرا قاسم

۔۔۔یہ قاسم مر چکا ہے!

سقفقوری سمندر کی سرابی ریت پر اِک اور قاسم مر چکا ہے!!

خشک وتر کے ہمکنارانہ تصرف کی امیں،

سادھو سمندر کے گلے سے

ایک جنیو کی طرح لپٹی۔۔۔گیانی ساحلی پٹی!

گیانی ساحلی پٹی سے کوسوں دُور تک ملحق
دیارِ بخت بد کے ریتلے مقتل کا آسودہ
نجانے کون سا مقتول قاسم ہے
کہ جس کی روح، خون راہیگاں کی احتجاجی جھنجھلاہٹ میں
رُتوں کے کشف الہامی سے اکثر پوچھتی رہتی ہے
آخر آبنائے سندھ کا تازہ لہو کب تک
بحیرۂ عرب میں غرق ہونے کی سزا پاتا رہے گا؟
راجہ داہر کی زمیں پر اپنے بن قاسم
کا ماتم کرنے والے لوگ جا کر کس زمانے میں جنم لیں گے؟؟؟

احمد مفاذ فازیؔ

غزل

یقیں تو دور ہے صاحب، ابھی گماں میں ہے
ہماری سوچ ابھی تک وہیں اُڑاں میں ہے
کوئی ہوا سے کہو اک نظر ادھر بھی کرے
وہ اک چراغ جو جلتا میرے مکان میں ہے
چھپا کے درد کو سینے میں مسکراتے ہیں
کہ اک کمال یہی میرے خاندان میں ہے
میں جانتا ہوں کہ مجھ میں ہی ہے رنگ کوئی
یہ خون تھوکا ہوا کس کا پاندان میں ہے
میں جھوٹ بیچنے نکلا تو لوٹ بھی آیا
گلاب بیچنے والا ابھی دکان میں ہے
ابھی تلک نہیں لوٹا سویر کا بھولا
کوئی تو دلفریب شئے اس آسمان میں ہے
یہ لوگ اس طرف کو کوچ کیسے جاتے ہیں
الٰہی ایسا بھی کیا دوسرے جہان میں ہے
ابھی کہو میرے قاتل سے ہوشیار رہے
ابھی تلک تو میرا جسم میری جان میں ہے
اس محبت کے کاروبار میں فازی مجھ کو
منافع جتنا بھی ہوا، میرے نقصان میں ہے

مبشّر سعید

غزل

حسن کے باغ سے لفظوں کو اُٹھانے لگ جائیں
ہم غزل لکھ کے ترے نام لگانے لگ جائیں

ایک لمحے کو اگر تیرا تبسم دیکھیں
ہوش والوں کے سبھی ہوش ٹھکانے لگ جائیں

دل کی تختی پہ اگر نام تمہارا لکھوں
تتلیاں اڑ کے ترے نام پہ آنے لگ جائیں

یہ عبادت ہے، عبادت ہے، عبادت ہے، کہ ہم
دل کی آواز مِیں آواز ملانے لگ جائیں

تم اگر ایک جھلک اپنی دکھا دو، اُن کو
سب مصور تری تصویر بنانے لگ جائیں

عین ممکن ہے جنہیں مجھ سے عداوت ہے سعیدؔ
وقت آنے پہ مرا ساتھ نبھانے لگ جائیں